اقبال شناسی

اور

آغا صادق

ترتیب

ڈاکٹر نوید حسن

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

Scanned with CamScanner

1995

نیاز احمد نے
این کیو پرنٹرز سے چھپوا کر
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

قیمت -/۳۰۰ روپے

ISBN - 969 - 35 - 0623 - 5

Scanned with CamScanner

ترتیب

سرآغاز — نوید حسن ۵

سوانح حیات ڈاکٹر نوید حسن ۹

پیش لفظ — ڈاکٹر سلیم اختر ۱۷

منظوم خراجِ عقیدت

اقبالؒ ۲۵

تری آواز ۲۶

۱۵ سال بعد ۲۷

یادِ اقبال ۲۹

مضامین

انسانِ کامل — اقبال کی نظر میں ۳۳

فکرِ اقبالؒ کے مآخذ ۳۷

علامہ اقبالؒ — ایک فنکار کی حیثیت سے ۵۳

اقبالؒ کا مرکزی خیال — خودی ۶۰

اقبالؒ اور مناظرِ قدرت ۶۳

اقبالؒ کی شاعرانہ حیثیتیں ۷۰

اقبالؒ کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز ۸۱

تشریح و تضمین — زخمہ و ساز

پیش حرف — آغا صادق ۹۱

تعارف — نسیم حجازی ۹۳

لا الہ الا اللہ ۹۴

اوجِ خودی ۹۶

جہاں تیرا ہے یا میرا ۹۸

ساقی ۱۰۰

شرق و غرب ۱۰۳

گیسوئے تابدار ۱۰۵

فرمانِ خداوندی ۱۰۸

حقیقت و مجاز ۱۱۱

من کی دنیا ۱۱۴

کشف الغطا ۱۱۶

تُو کہ مَیں ۱۱۹

Scanned with CamScanner

فریبِ نظر ۱۲۱
ستاروں سے آگے ۱۲۳
محبت ۱۲۶
مقامِ بندگی ۱۲۹
سفر ۱۳۲
اسد اللہی ۱۳۵
نوائے شوق ۱۳۸
تیرِ نیم کش ۱۴۱
فن ۱۴۴
فقر ۱۴۷
ہے دیکھنے کی چیز ۱۴۹
چشمِ عتاب ۱۵۱
دل ۱۵۳
قلندری ۱۵۵
پیامِ عشق ۱۵۷
بادۂ خانہ ساز ۱۶۰
جذبِ حرم ۱۶۳
یقین ۱۶۵
آزاد و محکوم ۱۶۸
مَیں اَور تُو ۱۷۰
دیدہ وری ۱۷۲
زندگی ۱۷۴
ترانۂ ملّی ۱۷۶
فرشتوں کا گیت ۱۷۸
تلافی ۱۸۰
سُرمۂ بصیرت ۱۸۲
او غافل افغان ! ۱۸۴
اپنے جاوید کے نام ۱۸۷
پیشگوئیاں ۱۸۹
اختتامیہ — آغا صادق، علامہ اقبالؒ کے روحانی شاگرد (شاخ طوبیٰ کے حوالے سے ایک جائزہ) — اکبر حمیدی ۱۹۴

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر نوید حسن

سرآغاز

میرے نزدیک والدِ بزرگوار آغا صادقؒ کو علّامہ اقبال سے کچھ اُسی قسم کی نسبت تھی، جیسی حضرت علّامہؒ کو مرشدِ رومیؒ سے تھی۔ اُنھوں نے علّامہ کے افکار کو پوری طرح جذب کرکے، اپنے شعر و ادب کے آب و گل بنا دیا اور تفہیم اقبال کے سلسلے میں گوناگوں کوششیں کیں۔ وُہ خود لکھتے ہیں "جب سے ہوش سنبھالا ہے، اقبال مست ہوں —— بادۂ اقبال پیتا بھی رہا ہوں اور پلاتا بھی رہا ہوں۔"

جس سال حضرت آغا نے فارسی میں ایم۔ اے کیا، اُسی سال حضرت علّامہ اقبالؒ عالمِ جاودانی کو رخصت ہوئے۔ اُن کی وفات کے بعد ۳۵ برس تک آغا پیامِ اقبالؒ کی مختلف سطحوں پر تبلیغ و اشاعت کا اہتمام کرتے رہے۔ وہ تقریباً تیس برس تک تعلیم و تدریس سے وابستہ رہے اور طلبہ کے دِلوں میں رُوحِ اقبال اتارنے کی سعیِ بلیغ کی۔ اخبارات و رسائل میں فکرِ اقبال کے بہت سے اہم گوشے نمایاں کیے —— ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے اقبالیات کے مختلف پہلوؤں پر فکر انگیز تقاریر نشر کرتے رہے —— ایک نہایت وقیع و رفیع کام یہ کیا کہ حضرتِ اقبالؒ کی چالیس منظومات کی نثری تشریح و تفسیر کے ساتھ ساتھ اُن کی ایسی تضامین کیں، جو پیامِ اقبالؒ کی بھرپور وضاحت کے ساتھ ساتھ اس کی توسیع بھی کرتی ہیں۔ یہ کام انھوں نے پورے شاعرانہ حُسن و جمال کے ساتھ سرانجام دیا ہے۔ یہ تشریحات و تضامین اُنھوں

Scanned with CamScanner

نے اپنی زندگی میں "زخمہ و ساز" کے نام سے چھپوائیں اکثر رفقائے کرام اور آغا صاحب کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ "اقبالیات صادق" کو ایک الگ کتاب کی صورت میں چھپوایا جائے۔ اُن کی اس خواہش کی تعمیل کر کے میں بہت مسرور ہوں کہ اس طرح ایک مفید جہت نما اور رُوح پرور کتاب سامنے آ رہی ہے۔ اُن کا پُرخلوص تعاون رسمی تشکّر سے ماورا ہے۔

حضرت آغا صادق کی تحسینِ اقبال کے بارے میں میرا کچھ کہنا اگرچہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا پھر بھی میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ حضرت آغا صادق کے تنقیدی و تشریحی مضامین و تضامین شگفتہ بھی ہیں اور بصیرت افروز بھی یہ پیامِ اقبال کے بیشتر گوشوں کو منوّر کرتے ہیں اور نقدِ اقبال کے باب میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

تشریح و تضمین، حضرتِ آغا صادق کا وہ زندۂ جاوید کام ہے جو اقبالیات کے باب میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ کام ایسا آدمی ہی کر سکتا تھا، جو بیک وقت قادرالکلام شاعر، بابصیرت نقّاد، فاضل استاد، عاشقِ اقبال اور "من تو شدم تو من شدی" کی منزل پر فائز ہو۔

مَیں مشہور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر کا بھی شکر گزار ہوں، جنہوں نے کتاب کا گرانقدر پیش لفظ تحریر فرمایا۔ کتاب کی ترتیب و تہذیب میں پروفیسر حفیظ تائب اور عاشور کاظمی اور برادر گرامی سید جاوید احسن کے مفید مشورے بھی شامل ہوئے۔ اس لیے وہ بھی شکریے کے حقدار ہیں۔

(ڈاکٹر) نوید حسن ایف آر سی ایس

لندن، ۱۶۔ دسمبر ۱۹۹۴ء

Scanned with CamScanner

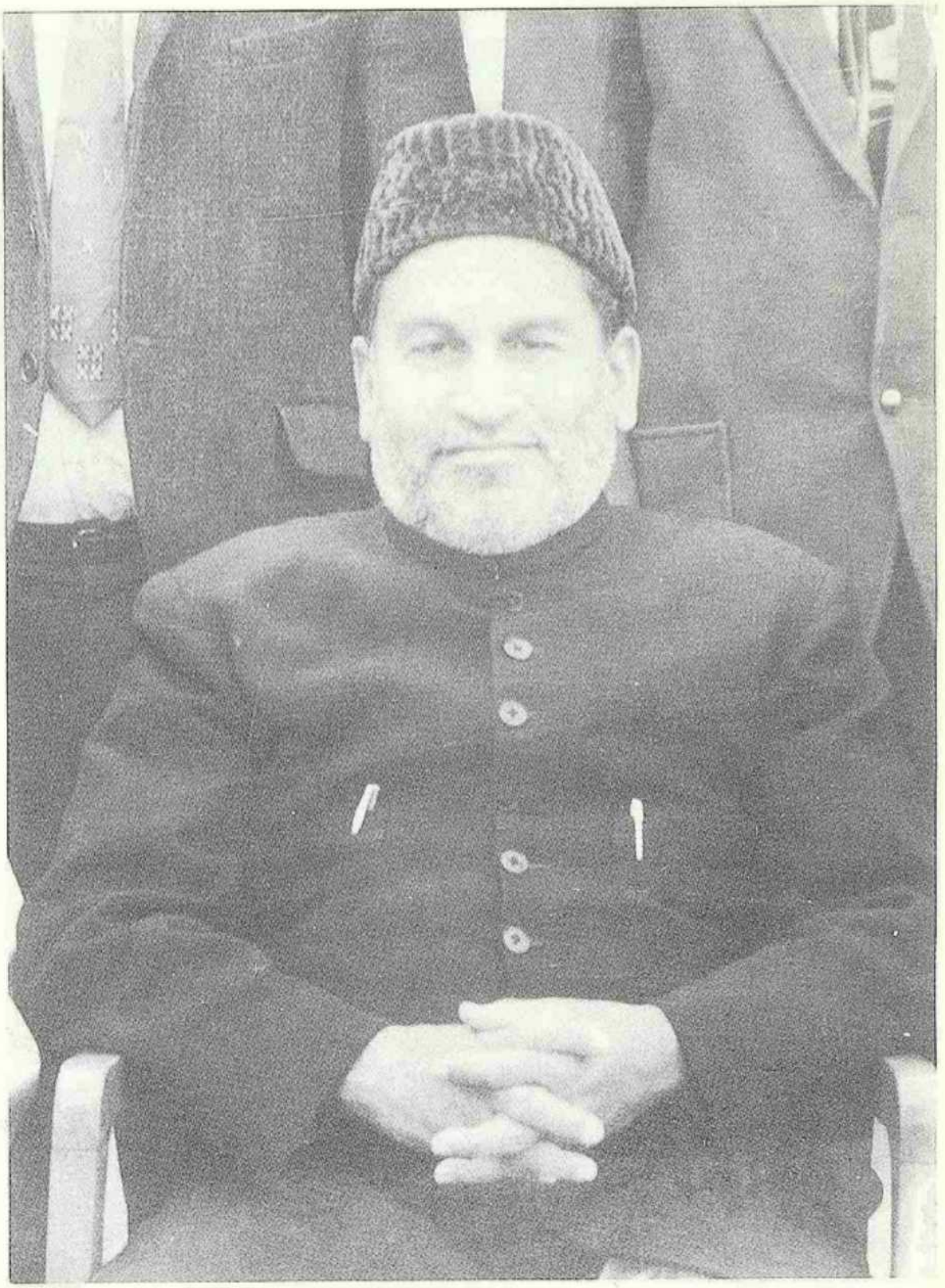

Scanned with CamScanner

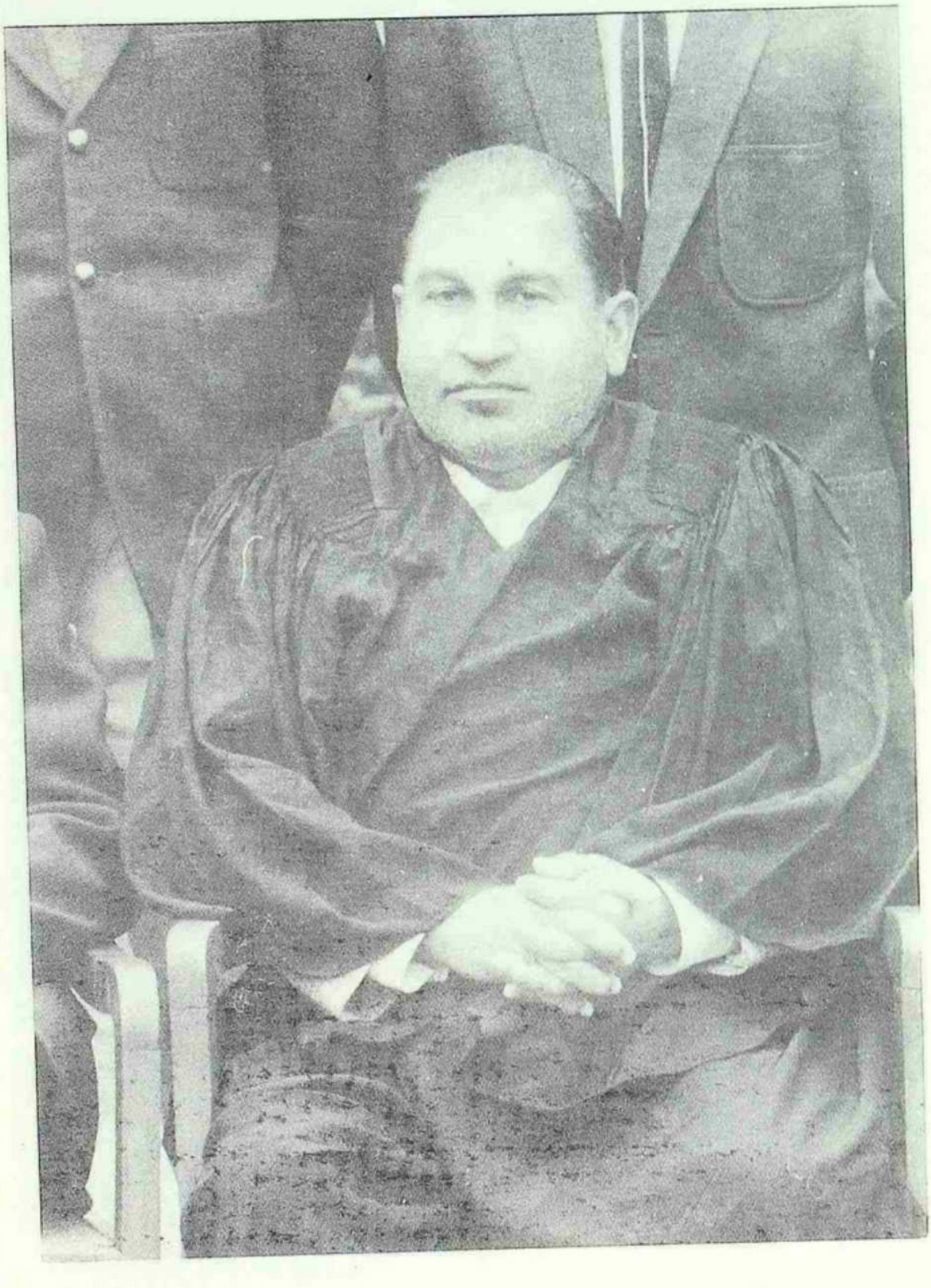

Scanned with CamScanner

سوانح حیات

آغا صادق کے آباؤ اجداد کا سلسلہ جو شجرۂ نسب میں محفوظ ہے۔ حضرت امام علی نقی سے شروع ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ان کے مورث اعلیٰ "محمود مکّی" تھے جو مکّہ معظمہ سے تشریف لائے تھے۔ ان کا مقبرہ آج بھی دریائے سندھ کے کنارے موجودہ شہر سکھّر میں موجود ہے۔ محمود مکّی کی اولاد پنجاب سندھ سے لے کر دہلی اور لکھنؤ تک ہندوستان کے مختلف شہروں میں بس گئی۔

۲۵ دسمبر ۱۹۰۹ء کو آغا صادق مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں جسے ڈیرہ سیّداں (سیدوں کی بستی) کہتے تھے۔ میں ایک سیّد خاندان میں پیدا ہوئے۔ آغا صاحب کے جدّ امجد فارسی اور عربی کے جیّد عالم تھے۔ آپ کے والد سیّد خیر علی شاہ اپنے باپ کی طرح جامع کمالات تھے۔ خوشنویسی، موسیقی تیراکی اور شکار اور اسلام کی تبلیغ مشاغل میں شامل تھے۔

آغا صاحب کا نام آغا صادق حسین نقوی تھا مگر حلقہ ادب اور تدریس میں صرف "آغا صادق" کے نام سے مشہور ہوئے ان کا بچپن خالص علمی اور مذہبی ماحول میں گزرا۔ ان کی والدہ کنیز حسنین ایک صوفی [illegible] علم دوست خاتون تھیں۔ ان کی تربیت میں والدہ والدہ اور خاص طور پر ان کے ماموں سیّد ظفر علی شاہ کا ہاتھ تھا (جو بعد میں ان کے سسر بھی ہوئے) اس کا تذکرہ وہ اپنی کتاب "صبح صادق" میں خود کرتے ہیں۔

تعلیم کے مراحل بتدریج طے ہوئے ۱۹۲۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اس کے بعد کچھ عرصہ تک ملازمت اختیار کی۔ پھر دوبارہ تعلیم شروع کی ایف اے، منشی فاضل۔ ادیب

Scanned with CamScanner

فاضل اور بی اے پاس کیا۔ پھر کچھ عرصہ تک محکمہ انہار میں بطور سگنیلر ملازمت اختیار کی۔ اس دور کے اشعار اسی کی عکاسی کرتے ہیں۔

پشیماں ہوں کیوں نہر میں آ کے ڈوبا
میں ابتک ہوں اس شرم سے پانی پانی
ستم ہے کہ تاروں میں جکڑا ہوا ہوں
طبیعت میں گو برق سی ہے روانی

آغا صاحب نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز گورنمنٹ مڈل ہائی سکول ننگل انبہاء (مشرقی پنجاب) میں بطور فارسی اور اُردو استاد شروع کیا ہر آن حصول علم کی کوششوں کے نتیجے میں ۱۹۳۸ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے فارسی سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا دو سال کے بعد انہیں M.O.L کی ڈگری ملی جو اُردو۔ فارسی۔ اور عربی کے ماہر کو دی جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ بلوچستان میں فارسی اور اُردو کے لیکچرر مقرر ہوئے ۱۹۴۵ء میں سینئر لیکچرر اور پانچ سال کے بعد پروفیسر بنائے گئے (کوئٹہ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۹۷۵ء تک منسلک رہا ہے) ۱۹۵۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن مقرر ہوئے ۱۹۵۹ء میں کالج کے پرنسپل بنا دیئے گئے۔ اور دن یونٹ بننے کے بعد کوئٹہ کے علاوہ پنجاب کے مختلف علاقوں میں بطور پرنسپل رہے۔ ۱۹۶۵ء میں CSP کے طالب علموں کے ممتحن بھی رہے۔ (اُردو اور فارسی)

۱۹۶۶ء میں محکمہ تعلیم سے فراغت حاصل کی اور اس کے دو سال تک امامیہ کالج ساہیوال کے پرنسپل رہے اور ۱۹۷۲ء تک مکمل طور پر ریٹائرمنٹ حاصل کی۔

آغا صاحب کی محکمہ تعلیم سے وابستگی کم از کم تیس سال تک رہی ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا اکثر قیام کوئٹہ میں ہوتا تھا اور ان کو اس شہر سے بہت محبت تھی۔ سردیوں میں پنجاب کے شہر ملتان میں بھی رہا کرتے تھے۔ آغا صادق نے شعر و سخن میں قدم ۱۹۲۸ء کے قریب رکھا شروع میں اپنے والد صاحب سے اصلاح لی۔ اس کے بعد لبھورام جوش ملسیانی جو اس دور اور علاقے کے

Scanned with CamScanner

مشہور شاعر تھے سے رابطہ قائم کیا۔

غزل کی اصلاح اور تلمذ علامہ اقبال کے ایک شاگرد میاں محمد اختر لدھیانوی سے بھی کیا اور ان کے مراسم حضرت بیخود دہلوی کے ایک شاگرد رشید حضرت شیخ عبدالواحد یکتا سے بھی رہے۔ پاکستان بننے کے بعد عبدالمجید سالک، سر عبدالقادر (جنہوں نے "صبح صادق" کا دیباچہ بھی لکھا ہے) سے ادبی رسم وراہ رہی۔

آغا صاحب کی ادبی خدمات میں نثر، نظم، غزل، آزاد نظم رباعیات، تضامین سب شامل ہیں ۱۹۲۸ء لیکر ۱۹۷۷ء تک ادبی دنیا کی خدمت کی۔ ان کی غزلوں کے چھ مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ ان پر اقبال کا بہت اثر تھا۔ آزاد نظموں کا مجموعہ پریشاں کے عنوان سے شائع ہوا۔ آغا صاحب کا نظریہ شاعری فن برائے فن نہ تھا بلکہ وہ فن برائے زندگی کے قائل تھے۔ اس لیے ترقی پسند تحریک سے ان کے رشتے مضبوط تھے کچھ دنوں حلقہ ارباب ذوق کے سکریٹری رہے۔ لیکن بعدازاں بزمِ اقبال اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ رہے۔ رائٹر گلڈز سے بھی ان کی وابستگی رہی۔

ان کا کلام پاکستان کے چیدہ چیدہ رسائل و اخبارات، ہفتہ وار ماہوار میں شائع ہوا۔

——— جن میں افکار کراچی۔ ماہِ نو کراچی، مشرق کوئٹہ۔ جنگ کوئٹہ۔ نقوش لاہور۔ سویرا لاہور۔ امروز لاہور۔ لیل و نہار لاہور۔ نوائے وقت لاہور۔ چٹان لاہور۔ جنگ کراچی۔ عصمت کراچی اور قندیل لاہور شامل ہیں۔

آغا صاحب کا حلقہ احباب ذوق بہت وسیع تھا اس کی وجہ ان کا ذاتی اخلاق اور خط و کتابت میں پابندی تھی۔ پاکستان و ہندوستان کے مشہور شعرا اور ادیبوں سے راہ و رسم رہی اس کی وجہ نہ صرف مشاعروں میں شرکت یا ریڈیو پاکستان کی تقاریر تھیں بلکہ ذاتی اخلاق اور ملنساری بھی تھی جس کی وجہ سے بہت سے لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے۔

یقول :

زینت محفلِ سخندانی
مردِ روشن ضمیر ہے صادق

Scanned with CamScanner

ہے یہ تعریف بھی حقیقت بھی
شاعر بے نظیر ہے صادق

نظم ونثر کی اشاعت ان کی زندگی میں ادبی رسائل و جرائد کے علاوہ کتابی صورت میں بھی شروع ہوئی۔ ریڈیو پاکستان کی تقاریر کا مجموعہ" بردوش ہوا" کے نام سے لاہور کے پبلشر شیخ عنایت اللہ اینڈ سنز نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔ (مکتبہ ادبیات) اس کے یکے بعد دیگر اور دیوان کوئٹہ اور ملتان سے شائع ہوئے۔ ان کی آخری کتاب خانۂ فرہنگ ایران کوئٹہ نے شائع کی۔ مشاغل کے بارے میں ان کا اپنا شعر ہے ؎

پانچ شغل آغا صادق ہیں بہ لطفِ کردگار
شعر موسیقی تلاوت خوشنویسی اور شکار

بقول شہناز بانو آغا صاحب کی مختلف حیثیتوں کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ وہ شخصیت میں بطور باپ۔ دوست۔ استاد۔ شوہر افسر ماتحت شاعر نثر نگار نقاد اور ایک بے لوث مسلمان نظر آتے ہیں اور جوہر ڈبائوی کے الفاظ میں۔ اگر کسی نے شرافت کو مجسم دیکھنا ہو تو آغا صادق کو دیکھ لے (۱۹۵۶ء) اور ان کے شاگرد (جاوید ملک تونسہ شریف) کے بقول :

کردار کی دنیا میں ہے مومن کا سا انداز
افکار کی دنیا میں غریبوں کا ہے دم ساز
اخلاق کی خاتم میں ہے تابندہ نگیں تو
اخلاق و مروّت کی فضاؤں میں ہے شہباز

آغا صاحب میں انا کا احساس ہرگز نہیں تھا نہایت منکسر المزاج تھے ان میں علامہ اقبال کے اس شعر کا عملی اثر تھا :

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

Scanned with CamScanner

MATRIC 1925

آناصادق حسین

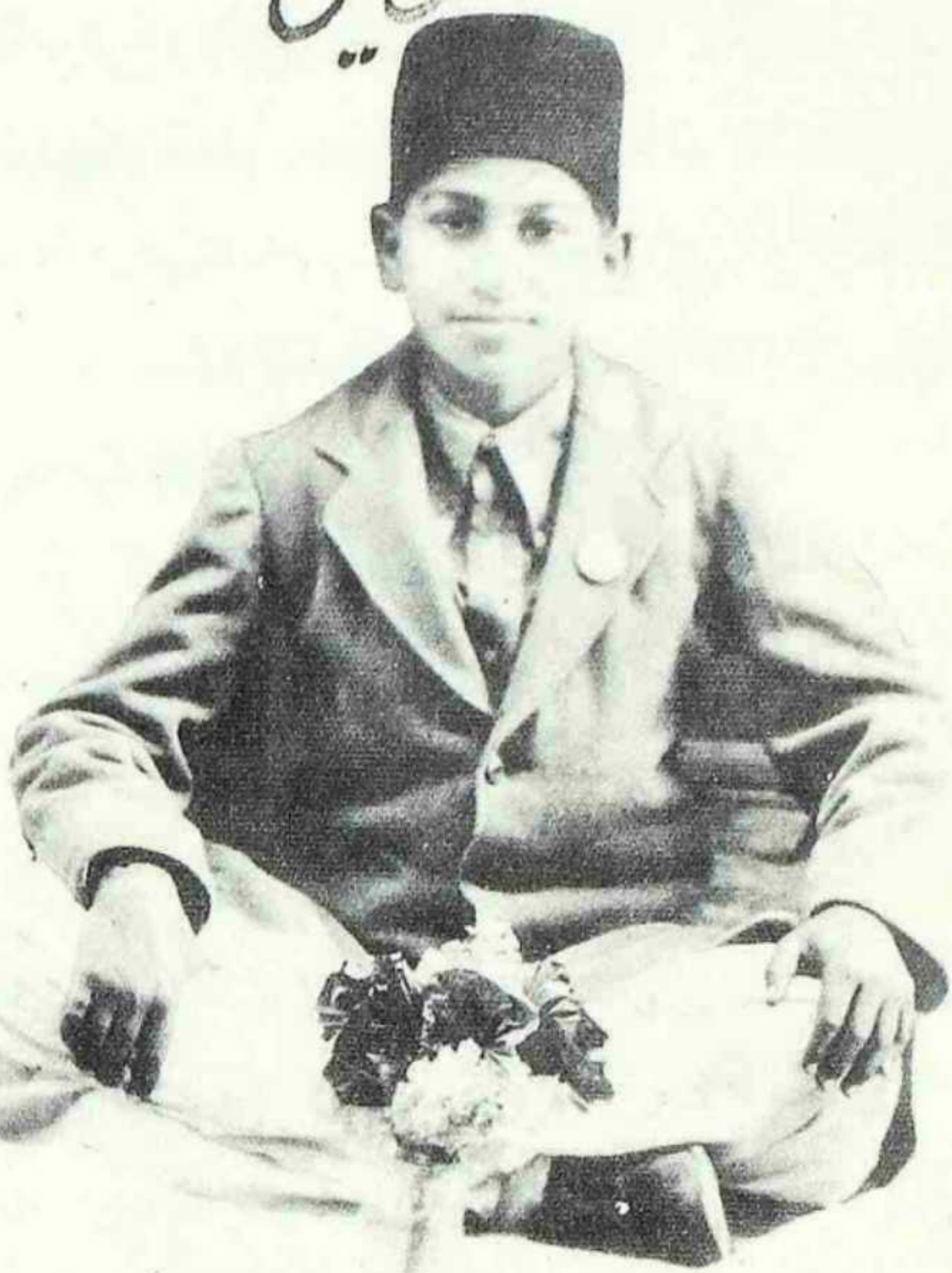

AGE 16

Scanned with CamScanner

آغا صاحب نے ہمیشہ شعراء اور ادیبوں کی اپنی زندگی میں مالی مدد بھی کی (جس کا چشم دید گواہ میں خود ہوں) یہ واقعہ مجھے خود یاد ہے کہ ایک جوان شاعر اپنا ذریعہ معاش کھو بیٹھے اور ایک شام گھر تشریف لائے اور بغیر کسی شرم کے مدد کی درخواست کی تو آغا صاحب نے اپنے گھر میں یہ کہا کہ جب تک یہ شاعر برسر روزگار نہیں ہو جاتا اس کے طعام اور رہائش کا بندوبست آغا صاحب کے گھر ہوگا۔ (ان کا نام ک ق تھا)

دوسرا اسی طرح کا واقع ایک اور نوجوان اشتراکی شاعر کے ساتھ ہوا۔ جسے کالج سے نکال دیا گیا تھا۔ چونکہ وہ علی الاعلان اشتراکی بن گئے تھے اور ملازمت کے دروازے ہر وقت بند رہتے تھے۔ انہیں بھی آغا صاحب نے گھر میں پناہ دی (ع ر غ) ان کے نزدیک انسان دشمنی اور دل آزاری ایک جُرم تھا۔ وہ کٹھن سے کٹھن حالات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے تھے۔ اور ان کے اپنے شعر کے الفاظ ہیں۔

کامیابی پہ کبھی اشک ٹپک پڑتے ہیں
نامرادی پہ کسی وقت ہنسی آتی ہے
دور اندیش طبیعت کا بُرا ہو یا رب
پھول کھلتے ہیں مری آہ نکل جاتی ہے

آغا صاحب کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا، جس کی فہرست دینا میرے لیے ممکن نہیں ہے قریبی دوستوں میں سے امروز کے احمد ندیم قاسمی۔ نقوش کے محمّد طفیل، عصمت کراچی کے رازق الخیری۔ ادیب سہارنپوری۔ ابن انشاء۔ صوفی تبسّم۔ عابد علی عابد۔ عاصی کرنالی۔ کبیر انور جعفری۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور نسیم حجازی جیسی بہت سی اہم شخصیات شامل ہیں۔

آغا صاحب کے شاگردوں کی دو اقسام ہیں۔ ایک تو وہ جو کالج میں شاگرد رہے اور بطور پروفیسر اور پرنسپل زیرِ تعلیم رہے اور عملی زندگی میں معاشی اور عملی ترقی کر کے پاکستان کے مختلف شعبوں میں پھیل گئے ان میں سابق گورنر خیر بخش مری اور چیف سیکریٹری

Scanned with CamScanner

شامل ہیں اور دوسرے وہ جو اُن سے شعری تلمذ کر چکے ہیں اور وہ ادب و سخن کے دلدادہ اشخاص ہیں۔ جنہوں نے ادبی دنیا میں نام پیدا کیا۔ ان کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ جس میں سے چند نام مجھے یاد ہیں۔ مثلاً عبدالعزیز خالد۔ ع سلام۔ رفیق راز۔ نور محمد ہمدم۔ کبیر انور جعفری۔ عطا شاد اور عاشور کاظمی وغیرہ۔ عاشور کاظمی سے میری معلومات کے متعلق ان کے دو رشتے تھے۔ ایک ترقی پسند سوچ اور دوسرے 'اقبالیات' کہ بربط احساس پہ کے بعد تک عاشور کاظمی کی شاعری پر اقبالیات کا رنگ غالب تھا۔ ان دونوں رشتوں کی مرکزی کڑی ڈاکٹر تاثیر تھے۔

آغا صاحب ایک دیندار۔ صوم و صلواۃ کے پابند انسان تھے اور تصوّف میں منصُورِ ثانی۔ ان کا یہ اپنا شعر اس چیز کی غمازی کرتا ہے:

مجھے داد دو کہ لب پر نہیں دعوۂ انا الحق
اُسی جوش پر اگرچہ مرا جذبۂ خودی ہے

(ریڈیو پاکستان ۱۹۶۶ء مشاعرہ)

طہارتِ لباس طہارتِ خیال اور طہارتِ بدن کی عملی پابندی کرتے تھے اور انسانیت کے حق میں تھے:

مقصد کی خبر نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں
مظہر نظر نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں
عالم فاضل ادیب ناظم ناثر
انسان اگر نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں

(آغا صادق)

آغا صاحب بقول ان کے شاگرد ایک محنتی اور فرض شناص استاد تھے اور اُردو اور فارسی کے لیکچرر تھے اس لیے انہیں اقبال حافظ سعدی اور غالب ازبر تھے اور وہ اپنے فن کو برتنے میں بخیل واقع نہیں ہوئے تھے۔

Scanned with CamScanner

بقول ن م ماطفی (ایرانی شاعر) ایک اچھے ملنسار دوست ایک ہمدرد انسان تھے۔

۲۰ جون ۱۹۷۳ء کو آغا صاحب نے ایک مشاعرہ کی صدارت کی۔ ۲۷ جون ۱۹۷۳ء کو انہیں سینے پر کچھ بوجھ محسوس ہوا۔ ۲۸ جون کو انہیں دل کا شدید دورہ پڑا سول ہسپتال کوئٹہ میں داخل کر دیئے گئے باوجود علاج کے یکم جولائی ۱۹۷۷ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

افسوس آغا صادق نقوی بھی چل بسے
بزم ہنر میں ذات سے جس کی تھا زیر و بم

ہر آنکھ اشک بار ہے ہر دل ہے سوگوار
آتی ہے، ہر طرف سے صدا ہائے شام غم

ہے نجوم و ماہ سے بھی دور تک صادق مقام
تابش خستہ کی جانب سے بھی ہو تم کو سلام

تبرکاً کتبہ۔ رئیس امروہی نے لکھا

ان کے مشہور شاگرد عبدالعزیز خالد نے زیر داغ دل میں ان کی وفات پر ایک نظم لکھی جس کا آخری شعر ہے۔

وارفتہ الحان انیس و اقبال
وابستۂ دامانِ حسینؑ ابنِ علیؑ

(ڈاکٹر) نوید حسن ایف آر سی ایس
(پسر آغا صادق مرحوم)
لندن۔ ۲۸ اگست ۱۹۸۹ء

پیش لفظ

"میرے نزدیک والدِ بزرگوار آغا صادق کو علامہ اقبال سے کچھ اسی قسم کی نسبت تھی جیسی حضرت علاّمہ کو مُرشدِ رومی سے تھی۔ انہوں نے علامہ کے افکار کو پوری طرح جذب کر کے، اپنے شعر و ادب کے آب و گِل بنا دیا اور تفہیمِ اقبال کے سلسلے میں گوناگوں کوششیں کیں، وہ خود لکھتے ہیں "جب سے ہوش سنبھالا ہے اقبال مست ہوں ـــــ بادۂ اقبال پیتا بھی رہا ہوں اور پلاتا بھی رہا ہوں"

(ڈاکٹر نوید حسن)

"آج پھر سازِ نفس پر زمزمہ پیرا ہے کون ؟
بے تکلف خلوتِ دل میں چلا آیا ہے کون ؟
کس کی تکبیریں حریمِ عرش سے ٹکرا گئیں
آہ کی صورت زمیں فرسا فلک پیما ہے کون ؟
روح کی گہرائیوں میں کون ہے پیوست آج
معنیٔ تقدیرِ عالم آج سمجھاتا ہے کون ؟
قوم کو بھی جو حیاتِ جاودانی دے گیا
زندۂ جاوید خود بھی ہو گیا ایسا ہے کون ؟

بالیقیں اقبالؔ ہے اقبالؔ ہے اقبالؔ ہے
ہم سخن قلب و نظر سے اس طرح ہوتا ہے کون ؟"

(آغا صادق)

قیامِ پاکستان کے وقت افقِ ادب پر نمایاں نظر آنے والی شخصیات میں آغا صادق (متوفی: یکم جولائی ۱۹۷۷ء) بھی شامل ہیں ـــــ معلّم، شاعر، نقاد، صوفی اور عبدالعزیز خالد جیسے شاعر کے استاد!

تیسری چوتھی اور پانچویں دہائی کے تخلیقی منظرنامہ پر نگاہِ بازگشت ڈالنے پر احساس ہوتا ہے کہ اگر ایک طرف ترقی پسند ادب کی تحریک جدید اذہان میں تحرّک پیدا کر رہی تھی تو دوسری طرف غزل کے روایتی اسالیب سے منسلک شعراء اور محض الفاظ کے بل پر شاعری کرنے والے بزرگوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ اگرچہ میراجی، جوش، فیض، راشد، ندیم اور مجید امجد جدید نظم کے معتبر نام بن چکے تھے مگر اقبال کے ملّی افکار اور قومی شاعری بھی توانا روایت کی صورت اختیار کر چکی تھی واضح رہے کہ حالی کے مسدس "مدوجزر اسلام" کی صورت میں قومی شاعری کی روایت خاصی پرانی قرار پاتی ہے ہر چند کہ تقویت علامہ اقبال کے جلال و جمال کے حامل اسلوب ہی سے حاصل ہوئی۔

علامہ اقبال اتنی عظیم تخلیقی شخصیت ہیں کہ انہیں اُردو ادب کی کسی تحریک، تخلیقی میلان، تنقیدی رجحان یا شعری دبستان سے وابستہ قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ تو خود ہی اپنی ذات کی صورت میں ایک مستقل تحریک، دائمی تخلیقی میلان، فعال تنقیدی رجحان اور اساسی شعری دبستان کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ زندگی میں بھی اور انتقال کے بعد پاکستان بن جانے کی وجہ سے بھی ـــــ قیامِ پاکستان سے قبل علامہ اقبال عمل جدوجہد اور انقلاب کے داعی کی حیثیت سے اہم تھے قیامِ پاکستان کے بعد تصوّرِ پاکستان کے خالق کی حیثیت سے۔ الغرض! اقبال نے اب محض ایک شخص، ایک شاعر، ایک مفکر یا

ایک راہنما کی حیثیت سے بلند ہو کر علامت کی صورت اختیار کر لی ہے اور علامت امر ہوتی ہے۔

علامہ اقبال کے فکر و فن، شاعرانہ عظمت اور افکار کی توضیح کے ضمن میں اتنا لکھا گیا کہ اقبالیات نے باقاعدہ اصطلاح کی صورت اختیار کر لی ہے، ایسی اصطلاح جس میں ہر عہد کے قلم کار، ناقدین، دانشور اور اقبال شناس اضافہ کرتے رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود بیشتر مقالات پڑھنے کے بعد!

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کا جو احساس رہتا ہے تو اس کا باعث یہ ہے کہ شعری اسلوب کے جلال و جمال اور افکار و تصوّرات کی گہرائی اور پیغام کی ہمہ گیری کے باعث اقبال کو نظامِ نقد کے مروّج فارمولوں سے جانچنا ممکن نہیں۔ بیشتر اقبال شناس اس رفعت سے ناآشنا ہیں جہاں سے بحیثیت شاعر اقبال وجدان حاصل کرتا ہے اس لیے اقبال شناسوں کی اکثریت کے مقالات محض تشریح و توضیح تک ہی محدود ہوتے ہیں اس سے علامہ اقبال کا تو کچھ نہ بگڑا ہاں! تکرار و توارد کے باعث اقبالیات کو بھان متی کے کنبہ میں تبدیل کر دیا گیا۔

علامہ اقبال زندگی میں بعض سیاسی اور بالخصوص دینی حلقوں میں متنازعہ بلکہ معتوب بھی رہے (ملاحظہ ہو علامہ کے بارے میں کفر کا فتویٰ) لیکن ان سے غیر مشروط محبّت کرنے والوں کی بھی کمی نہیں رہی، زندگی میں بھی اور انتقال کے بعد بھی ـــــ اب تو خیر وہ ممدوحِ عالم ہو چکے ہیں اور بھارت (جگن ناتھ آزاد) جرمنی (ڈاکٹر اینا ماری شمل) اٹلی (ایساندرو بوزانی) فرانس (لوس کلوڈ متنخ) انگلستان (ای۔ایم فاسٹر) ایران (علی شریعتی) روس (گورڈن پونسکایا) مصر (عبدالوہاب عزام) اور دیگر ممالک کے اقبال شناسوں کی مساعی سے اب اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت تشکیل پا چکی ہے ایسی روایت جس میں وقت کے ساتھ اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

ہمارے ہاں بھی ناقدین، دانشوروں اور اقبال شناسوں کے پہلو بہ پہلو عشاقِ اقبال کی صورت میں ایک اور طبقہ بھی ملتا ہے جو سرتاسر علامہ کی محبت میں سرشار، ان کے اسلوب کے قتیل اور افکار کے متوالے ہیں اور بلاشبہ آغا صادق بھی قبیلۂ اقبال کے ممتاز رکن ہیں —— جو عمر بھر شعر کی صورت میں علامہ اقبال کو احساساتی سطح پر خراجِ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے افکار کی تشریح کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لاتے رہے سو ان کے بقول :

منزل کی طرف راہنما ہے تری آواز
لاریب کہ اک بانگِ درا ہے تری آواز
اک پردۂ اسرارِ حقیقت ہے ترا ساز
اک نغمۂ خاصانِ خدا ہے تری آواز
انسان کی تقدیر کا آئینہ ترا دل
انسان کی تقدیر نما ہے تری آواز
اسلام کی بھولی ہوئی تاریخ تری لَے
توحید کی گم گشتہ فضا ہے تری آواز
قندیلِ محبت کی شعاعیں ترے اشعار
ایوانِ اخوّت کی بنا ہے تری آواز
پہنچے ہیں تری بات کی تہہ تک ابھی کم لوگ
دنیا ابھی سمجھی نہیں کیا ہے تری آواز

دنیا ابھی سمجھی نہیں کیا ہے تری آواز —— آغا صادق کے اس مصرعے میں اقبال شناسوں کی ذہنی مساعی اور اقبالیات کے ذخیرہ کا جواز مضمر ہے — چنانچہ خود آغا صادق بھی اسی مصرع کے مصداق عمر بھر فکرِ اقبال کی تشریح و توضیح میں مصروف

رہے اب ان کے لائق فرزند ڈاکٹر نوید حسن نے اپنے نامور والد کی اقبال کے بارے میں کہی گئی نظموں اور مقالات کو "اقبالیاتِ صادق" کے نام سے مرتب کر کے اقبال شناسوں کی خدمت میں ایک قابلِ قدر تحفہ پیش کیا ہے۔

جہاں تک "اقبالیاتِ صادق" میں شامل تنقیدی مقالات کا تعلق ہے تو صرف عنوانات ہی سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آغا صادق کو فکرِ اقبال کے کن پہلوؤں سے خصوصی دلچسپی تھی چند عنوانات ملاحظہ ہوں "انسانِ کامل اقبال کی نظر میں" ـــــ "فکرِ اقبال کے ماخذ" ـــــ "علامہ اقبال ایک فنکار کی حیثیت سے" ـــــ "اقبال کا مرکزی خیال خودی" "اقبال اور مناظرِ قدرت" ـــــ "اقبال کی شاعرانہ حیثیتیں" ـــــ "اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز" ـــــ ان مقالات پر مستزاد علامہ اقبال کی بعض اہم اور فکر انگیز نظموں کی تشریح و تضمین "زخمہ و ساز" کے عنوان تلے درج ہیں۔ یہاں آغا صادق معلّم کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں کہ بنیادی طور پر وہ ایک معلّم ہی تو تھے۔

مختصر پیش لفظ میں آغا صادق کی اقبال سے متعلق شاعری اور اقبال فہمی کے ضمن میں تمام تنقیدی کاوشوں پر روشنی ڈالنی مشکل ہے تاہم اتنا طے ہے کہ عشاقِ اقبال اپنے قبیلہ کے ایک اور رکن کا کھُلے بازوؤں سے خیر مقدم ضرور کریں گے۔ مجھے توقع ہے کہ جس محبت اور خلوص سے یہ کتاب پیش کی جا رہی ہے، اقبال شناسوں کے حلقہ میں اسی محبّت اور خلوص سے اس کی پذیرائی کی جائے گی۔

اگرچہ میں آغا صادق کے نام اور کام سے واقف تھا مگر ان سے ملاقات نہ ہو پائی حالانکہ وہ جس زمانہ میں ملتان آتے تھے میں بھی وہیں تھا لیکن مجھے یاد ہے کہ ملتان کے ادبی حلقوں میں ان کا نام عزّت اور احترام سے لیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر نوید حسن سے بھی تعارف نہیں وہ لندن میں پریکٹس کرتے ہیں، برادرم نیاز احمد نے بتایا کہ ڈاکٹر نوید حسن نے بغرضِ

اشاعت مسودہ ارسال کرتے وقت مجھ سے پیش لفظ لکھوانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا سو اس دور افتادہ اور نادیدہ مداح کی تعمیلِ فرمائش میں یہ چند سطریں تحریر کی ہیں — انہیں محض مختصر ترین الفاظ میں آغا صادق کا تعارف سمجھا جائے، محض چند تنقیدی کلیاں — اصل گلشن تو کتاب کی صورت میں، باذوق قارئین کو دعوتِ نگاہ دے رہا ہے۔

سلیم اختر

منظوم خراجِ عقیدت

Scanned with CamScanner

اقبالؔ

آج پھر سازِ نفس پر زمزمہ پیرا ہے کون ؟
بے تکلّف خلوتِ دل میں چلا آیا ہے کون ؟

پھونک ڈالے کس نے سینے شعلۂ گفتار سے
آتشیں نغمے خودی کے چھیڑنے والا ہے کون ؟

میکدے سے کون اٹھا آج یوں مینا بدست
ہوگئی سرشار ساری انجمن پیاسا ہے کون ؟

کس کی تکبیریں حریمِ عرش سے ٹکرا گئیں
آہ کی صورت زمیں فرسا فلک پیما ہے کون ؟

کر لیا ہے جذب کس نے احسنِ تقویم کو
ممکناتِ زندگی کی اک حسیں دنیا ہے کون ؟

خد و خالِ فطرتِ انساں نکھرتے ہی گئے
آگیا لے کر خود آگاہی کا آئینا ہے کون ؟

روح کی گہرائیوں میں کون ہے پیوست آج
معنیٔ تقدیرِ عالم آج سمجھاتا ہے کون ؟

غنچے غنچے سے مجھے آتی ہے آج اس کی مہک
آج پھر روحِ چمن بن کر چمن آرا ہے کون ؟

قوم کو بھی جو حیاتِ جاودانی دے گیا
زندۂ جاوید خود بھی ہوگیا ایسا ہے کون ؟

بایقیں اقبال ہے اقبال ہے اقبال ہے
ہم سخن قلب و نظر سے اس طرح ہوتا ہے کون ؟

Scanned with CamScanner

(خطاب بہ اقبالؔ)

تری آواز

منزل کی طرف راہ نما ہے تری آواز
لاریب کہ اک بانگِ درا ہے تری آواز

گونجی ہے اذانوں کی طرح ارض و سما میں
مانندِ سحر خواب رُبا ہے تری آواز

سینہ کے لئے شُعلہ، دلوں کے لئے شبنم
یا سوزِ نفس ہے ترا یا ہے تری آواز

ٹکرائی ہے یہ عرش کے پردوں سے کئی بار
گویا صفتِ آہِ رسا ہے تری آواز

ہر لمحہ رہا جانبِ گردُوں گزر اس کا
شاید کوئی مقبُولِ دُعا ہے تری آواز

اک پردۂ اسرارِ حقیقت ہے ترا ساز
اک نغمۂ خاصانِ خُدا ہے تری آواز

مِلتی ہے اسی سے دلِ مجرُوح کو تسکین
درد و غمِ دوراں کی دوا ہے تری آواز

اِنسان کی تقدیر کا آئینہ ترا دِل،
اِنسان کی تقدیر نما ہے تری آواز

مِلّت کا دھڑکتا ہُوا دل ہیں ترے نغمے
ایمان کے چہرے کی ضیا ہے تری آواز

اِسلام کی بُھولی ہُوئی تاریخ تری لَے
توحید کی گُم گشتہ فضا ہے تری آواز

قندیلِ محبّت کی شعاعیں ترے اشعار
ایوانِ اُخوّت کی بنا ہے تری آواز

اُلجھے ہُوئے حالات کو حل جس نے کیا ہے
اِس دَور میں وہ عقدہ کُشا ہے تری آواز

پہنچے ہیں تری بات کی تہہ تک ابھی کم لوگ
دُنیا ابھی سمجھی نہیں کیا ہے تری آواز

Scanned with CamScanner

۱۵ سال بعد

(۱)

پندرہ سال کے بعد اب ہے تری یاد آئی
مجھ کو محسوس ہُوا تجھ سے مخاطب ہُوں میں
گونج اُٹھے مرے کانوں میں خودی کے نغمے
پھر ترے سوز ترے ساز کا طالب ہُوں میں

(۲)

تُو نے جو بات کہی سارے زمانے نے سُنی
تُو نے جو گیت الاپے وہ فضا میں پھیلے
ایک آہنگ تھا نشتر تھا فسوں تھا لَے میں
تیرے آہنگِ قلم ارض و سما میں پھیلے

(۳)

مانتا ہُوں کہ تجھے اہلِ نظر مان گئے
جانتا ہُوں کہ تجھے جانِ وفا جان گئے
حُسنِ مستقبلِ آدم کا نکھر سکتا ہے
تیرے آئینہ ادراک سے پہچان گئے

(۴)

لیکن اے عظمتِ آدم کے پیمبر اب تک
سطحِ بینوں کی عقیدت کا سہارا ہے تُو
کجکلاہوں کا یہ دعویٰ ہے کہ تو اُن کا ہے
بختِ برگشتہ یہ کہتے ہیں ہمارا ہے تُو

(۵)

جانتا ہُوں تری دُنیا کے غریبوں کی یہاں
کِس طرح کٹتی ہے شب کیسے سحر ہوتی ہے
تلخ ہیں بندۂ مزدُور کے اوقات ابھی
فاقہ مستی میں ابھی ان کی بسر ہوتی ہے

Scanned with CamScanner

(۶)

در و دیوار میں جنبش بھی نہیں ہے پیدا
مرکزِ عیش ہی کاخِ امرا ہیں ابتک
بار در خوشۂ گندم تو بہت ہیں لیکن
وہی دہقاں ہیں کہ محرومِ غذا ہیں ابتک

(۷)

تُو نے تخلیق کیا تھا جو تصور میں جہاں
چشمِ آفاق سے ابتک وہ جہاں اوجھل ہے
دل کو اک ٹھیس سی لگتی ہے تری یاد کے ساتھ
غم کا ماحول ہے ایسا کہ فضا بوجھل ہے

(۸)

سب کا سرمایہ ہیں تیرے یہ رسیلے نغمے
اِن پہ ایوانِ امارت کا اجارا کیوں ہو؟
ان گنت خاک نشینوں کا بھی حق ہے تجھ پر
میر و سُلطاں ہی کو یہ حُسن گوارا کیوں ہو؟

(۹)

سروری جن کو ملی ہے تری درویشی سے
وہ یہ کہتے ہیں فقیروں کی صدا کچھ بھی نہیں
تیرے پیغام کی تعبیر بدل دیتے ہیں
ان کا فن عیش پرستی کے سوا کچھ بھی نہیں

(۱۰)

خواجہ و بندہ میں ہے فاصلہ ابتک کتنا
اب بھی دُنیا پہ مسلّط ہے وہی کُہنہ نظام
دین کے نام پہ سو ظُلم روا رکھتی ہے
ابھی سمجھی نہیں دُنیا ترا منشائے کلام

(۱۱)

اپنا کہتا ہے تجھے شوکتِ شاہی کا غرُور
فقر کو ناز ہے کرتا ہے سرافراز مجھے!
آپ ہی فیصلہ کر دے کہ تو کس کا ہے؟
دے کسی غرفۂ جنت سے پھر آواز مجھے!

Scanned with CamScanner

یادِ اقبالؒ

اقبال پھر یاد آگیا　　پھر رُوح کو تڑپا گیا
پھر زندگی کا راستہ　　کھویا ہُوا تھا پا گیا

اقبال پھر یاد آگیا

مشرق کی جاں کہیئے جسے　　رُوحِ رواں کہیئے جسے
اپنے وطن کا ذکر کیا　　فخرِ جہاں کہیئے جسے

اقبال پھر یاد آگیا

وہ محرمِ رازِ درُوں　　وہ رہبرِ دشتِ جنُوں
جس کی کمندِ شوق میں　　جبریل اک صیدِ زبُوں

اقبال پھر یاد آگیا

وہ مردِ خُود آگاہ تھا!　　وہ غازیٔ جنگاہ تھا
تارے بھلا کیا چیز ہیں　　صیادِ مہر و ماہ تھا!

اقبال پھر یاد آگیا

Scanned with CamScanner

وہ صاحبِ اسرار تھا　　وہ بندۂ خُود دار تھا
بے ہوشیوں میں باخبر　　مستی میں بھی وہ ہشیار تھا
اقبال پھر یاد آگیا

جس کی نگاہِ تیز بیں　　ہفت آسماں کے پار تھی
جس کی زبانِ دلنشیں　　شمشیرِ جوہر دار تھی
اقبال پھر یاد آگیا

ایسا نہ آیا تھا کوئی　　ایسا نہ آئے گا کوئی
جو گیت اُس نے گائے ہیں　　شاید نہ گائے گا کوئی
اقبال پھر یاد آگیا

استغفراللہ کیا کہا　　اقبال جا سکتا نہیں
دستِ فنا اس نقش کو　　ہرگز مٹا سکتا نہیں
اقبال پھر یاد آگیا

اقبال زندہ ہے ابھی　　اور زندۂ جاوید ہے
اس کا پیامِ زندگی　　اُمید ہے اُمید ہے
اقبال پھر یاد آگیا

وہ شہرۂ آفاق ہے　　چرچے ہیں جس کے دہر میں
بزمیں ہیں جس کے نام کی　　ہر مُلک میں ہر شہر میں
اقبال پھر یاد آگیا

یہ خطۂ ارضِ حسیں　　مرد آزما مرد آفریں
بیگانہ ہو اقبال سے　　ممکن نہیں، ممکن نہیں
اقبال پھر یاد آگیا

Scanned with CamScanner

مضامین

Scanned with CamScanner

اِنسان کامل

(اقبال کی نظر میں)

اقبال ، اس صدی کا مفکرِ اعظم ، نباضِ فطرت اور مبصرِ حیات ہے ۔ اُس نے اپنے فلسفیانہ افکار سے عہدِ حاضر کے اذہان کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے اور چوں کہ اس کا ذریعۂ اظہارِ خیال شعر ہے ۔ اس لئے اس کے بلند پایہ خیالات شعر کے سانچے میں ڈھل کر دلنشیں ، دلآویز اور مؤثر ہو گئے ہیں ۔ چونکہ وہ حیات، کائنات اور خصوصاً شاہکارِ فطرت یعنی انسان کے متعلق واضح اور مربوط نظامِ فکر رکھتا ہے ۔ اس لئے اس موضوع پر اس کے افکار کا مطالعہ معلومات افزا اور دلچسپی سے خالی نہیں ۔ چنانچہ انسان کامل کے متعلق اس کے فلسفے کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے ۔ سب سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ اس کے انسان کامل کا نظریہ یورپ کے فلسفیوں خصوصاً مشہور جرمن فلسفی نیٹشے کے نظریے پر مبنی یا اس سے ماخوذ ہے لیکن گہری نظر اور دقیق مطالعہ سے یہ حقیقت قطعی دلائل سے ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ مماثلت یا مشابہت بالکل سطحی سی ہے اور اقبال انسان کامل کے متعلق بذاتِ خود ایک مخصوص فلسفے کا موجد اور بانی ہے ۔ البتہ یہ اُصول مسلّمہ ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ کوئی مجددِ فن اپنے پیشہ وروں کے ثمرات دل و دماغ کو جذب کئے بغیر افکار کی دُنیا میں قدم نہیں رکھ سکتا ۔ اقبال بھی اپنے پیشروؤں کے خیالات سے ناآشنا نہیں رہ سکتا تھا ۔ لیکن اس نے انہیں جذب کرنے کے بعد اپنایا ۔ غیر صالح عناصر کو رد کیا اور صالح عناصر کا اپنی طرف سے اضافہ کیا ۔ اس لئے اقبال کی طبعزادگی یا ORIGINALITY میں کوئی کلام نہیں ۔ جن

Scanned with CamScanner

افکار سے اقبالؔ کے خیالات کی مشابہت پائی جاتی ہے، لیکن ان میں نیٹشے کے فوق البشر اور اقبالؔ کے مردِ کامل کا تصور بھی ہے۔ دونوں کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نیٹشے کا فوق البشر یعنی مستقبل کا اعلیٰ انسان، ظالم، جابر، خود غرض اور حریصِ اقتدار شخصیت ہے۔ وہ رحم، اخلاق، عفو، احسان وغیرہ ایسے خصائل حسنہ سے قطعاً معرّا ہے۔ لیکن اقبال کے مردِ کامل کے عناصر جہاں گانہ میں قہاری جبروت کے علاوہ قدوسی و غفاری ایسی صفات بھی ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اس کے برعکس نیٹشے کا فوق البشر کسی اخلاقی قانون کا پابند نہیں۔ اس کے عمل کا معیار اندھا دھند تصرّف اور تغلّب ہے۔ علاوہ ازیں وہ اس کی تخلیق کو حیاتیاتی ذرائع پر منحصر سمجھتا ہے۔ یعنی مستقبل کا یہ انسان بہتر سے بہتر نسل کشی کا ثمرہ ہوگا۔ اس کے نزدیک یہ ہوگا انسانیت کا نجات دہندہ۔ لیکن اقبالؔ کا مردِ مومن یا انسانِ کامل اجتماعی اختیار سے افضل ہے۔ صفاتِ جلالی اور جمالی دونوں کا حاصل ہے۔ اس میں فقر و شاہی اور ناز و نیاز پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔

اس کی سیرت یہ ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

اس کی اُمیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگاہ دلنواز

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اقبالؔ ورڈزورتھ کی طرح انسان کو عالمِ فطرت میں مدغم نہیں کر دیتا، بلکہ اس کے ہاں وہ ہمیشہ اشرف المخلوقات کی بلندی پر فائز رہتا ہے اور کبھی سبزہ و گل کی پستیوں میں نہیں اترتا اور زندگی کا یہ نچوڑ اور کائنات کا خلاصہ یعنی انسانِ کامل سمٹ سمٹا کر محض ایک چیز نہیں بن جاتا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اسے تمام مظاہرِ زندگی سے برتر، ممتاز اور متصرف قرار دیتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا کی پیدا کی ہوئی کائنات میں نظم و حسن اور ترتیب پیدا کرتا ہے اور خدا کی بخشی ہوئی تخلیقی صلاحیتوں اور تعمیری قوتوں کو بروئے کار لا کر اس دنیا کو حسین تر اور جمیل تر بنا دیتا ہے۔

اپنی مشہور نظم محاورہ خدا و انسان میں وہ انسان کی ایسی نمایاں خصوصیت کی طرف لطیف اشارہ کرتا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدیم　　سفال آفریدی ایاغ آفریدیم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی　　خیابان و گلزار و باغ آفریدیم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشیشہ سازم

اقبال تسخیرِ فطرت کو انسانِ کامل کا وظیفۂ حیات قرار دیتا ہے اور علم اشیاء سے متصف ہونا اس کا فرضِ عین سمجھتا ہے اور علم اشیاء ہی سے تسخیرِ فطرت کی مہم سر ہو سکتی ہے اور یہی خلافت الٰہیہ کی شرطِ اوّل ہے۔ اقبال کے نزدیک تسخیرِ فطرت ہی انسان کو نیابت الٰہیہ کا مستحق اور وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ (یعنی بے شک ہم نے انسان کو برتری بخشی) کا مصداق بناتی ہے، وہ بار بار انسانِ کامل کی تخلیقی قوتوں پر زور دیتا ہے کیونکہ ان کے بغیر انسان اپنے مقام سے گر جاتا ہے۔

اقبال اسلام کے مثالی انسانِ کامل کی تصویر کشی اس طرح کرتا ہے کہ انسان زمین پر خدا کا خلیفہ یا نائب ہے۔ وہ خدا کے قوانینِ عالمگیر زمین پر نافذ کرتا ہے۔ اس کی صفاتِ عالیہ سے اپنے آپ کو متصف کرتا ہے اور اس کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگتا ہے۔ اس لئے اس کے حق میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی سی صفات اپنے اندر پیدا کرے۔ اقبال کے نزدیک انسانِ کامل ایک مجبور اور بے بس ذات یا ایک منفی حقیقت نہیں بلکہ وہ معین اقدار کا حامل اور مثبت صفات کا امین ہے۔ وہ بحکم خدا فاعل و مختار اور کائنات میں متصرف اور خدا کی تخلیقی قوتوں کا مظہر ہے۔ کائنات کی گتھیوں کو سلجھانا اس کا لائحہ عمل ہے اور عناصر کی باگ ڈور سنبھالنا اس کا پیدائشی حق ہے۔ ہوا کے جھونکے اس کے فراش، سورج کی کرنیں اس کے باورچی اور بجلی کی لہریں اس کی پیغامبر ہیں۔ فطرت کی قوتوں کی تسخیر اس کی امتیازی شان اور آب و خاک و باد و آتش سے خدمت لینا اس کا لازمۂ حیات ہے۔

تسخیرِ کائنات خدا کے قانون کی اطاعت ہے بلکہ اس کے لئے اپنی صلاحیتوں کو صرف کرنا عبادت ہے۔ عناصر اپنی فوقیت اور اپنے پر خدا کی حاکمیتِ مطلقہ کا اقرار انسانِ کامل کا اصول حیات ہے۔ اقبال نے انسانِ کامل کی خودی یعنی شخصیت کی تربیت کے جو تین مراحل بیان کئے ہیں ان کی اصل یہ ہے ؎

مرحلہ اوّل اطاعت ہے۔ یعنی اس دستورُ العمل کی اطاعت جو رسولِ مقبول کے ذریعے امتِ مسلمہ

کو دیا گیا ہے۔ اس مرحلے پر انسانِ کامل قرآنِ مجید کی اس آیتِ کریمہ کا مصداق ہوتا ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (یعنی اللہ اس کے رسُول اور تم میں سے جو حاکم ہو۔ اس کی اطاعت کرے۔ چنانچہ اقبالؔ کہتا ہے۔

تابعِ حق دید نش نا دید نش

یعنی اس کا دیکھنا نہ دیکھنا، کھانا پینا، سُننا غرض سب کچھ اس کے تابع ہوتا ہے۔ اسی جذبۂ اطاعت سے جذبۂ قربانی پیدا ہوتا ہے۔ اسی جذبہ کے زیرِ اثر خلیلؑ اللہ اپنے لختِ جگر کے گلے پر چھری رکھ دیتے ہیں اور اسی جذبہ کے تحت سیّد الشہدا حضرت امام حُسین علیہ السلام اپنی جان و مال، اولاد اور اعزاؑ کی قربانی پیش کرتے ہیں اور یہ دونوں انسانِ کامل کے مثالی کردار ہیں۔

مرحلۂ دوم ضبطِ نفس ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جبکہ مردِ مومن، خوفِ دُنیا، خوفِ مرگ اور خوفِ آلام زمین و آسمان پر غالب آجاتا ہے اور حُبِّ مال، حبِّ عیال اور حبِّ جاہ کو زیر کر لیتا ہے۔ یہاں بھی اقبال توحید میں پناہ ڈھونڈتا ہے ؎

تا عصائے لا الٰہ داری بدست — ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شُد — فارغ از بیمِ زن و اولاد شُد

اب رہا یہ امر کہ ضبطِ نفس کس طرح کیا جاتا ہے، تو اقبالؔ تعلیماتِ قرآن کی روشنی میں فرائض کی بجاآوری مثلاً نماز روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کو اس کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔

مرحلۂ سوم نیابت و خلافتِ الٰہیہ کا ہے۔ جب انسانِ کامل پہلے دو مرحلوں سے گزر جاتا ہے تو اس مقامِ جلیل پر فائز ہو جاتا ہے۔ جس کا اظہار اقبالؔ اس طرح کرتا ہے ؎

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است — ہستیٔ او ظلِّ اسمِ اعظم است
از رموزِ جنّ و کُل آگہ شود — در جہاں قائم بامر اللہ شود
پختہ سازد فطرتِ ہر خام را — از حرم بیروں کند اصنام را

نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر

یہ ہے اقبالؔ کے انسانِ کامل کا ایک نمونہ۔

فکرِ اقبالؔ کے ماخذ

حقائق اور معارف کی دنیائے نو میں اقبال آدمِ نو کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک نیا انسان ہے جس نے نئی دنیا کی بنیاد رکھی۔ اقبال اب صرف ایک نام ہی نہیں بلکہ ایک مستقل ادارہ، ایک منظم سلسلۂ خیال، ایک مخصوص طرزِ فکر، زندگی کی بیّن تعبیر، اسلام کی ایک واضح تفسیر اور ملّتِ اسلامیہ کا ایک جاذب نقطۂ نظر بن چکا ہے۔ اقبال فطرت کا نباض ہے، زندگی کا مبصّر ہے، اسلامی نظامِ حیات کا شارح ہے اور نہ صرف قرنِ حاضر کا بلکہ تمام ادوار کا مفکرِ اعظم ہے۔ اقبال ایک ایسا شاعر ہے جس نے حیات کے بحرِ بے پایاں میں غوطہ زن ہو کر ابدی صداقتوں کے جوہر ریزے نکالے۔ جس نے زندگی کے ساز پر انسان کے روشن مستقبل کے وجد انگیز راگ چھیڑے، جس نے انسان کی لاانتہا صلاحیتوں کا جائزہ لیا، جس کے ناخنِ فکر نے بے پناہ امکانات کی گتھیاں سلجھائیں، جس کے وجدان نے خیر و شر کو صحیح معیار بخشا، جس کی نگاہِ پردہ در نے دانشِ حاضر کی کوتاہیوں کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا، جس نے مشرق و مغرب کی سیاستِ گمراہ کو للکارا، جس کے فکرِ عمیق نے روحِ مذہب کی اتھاہ گہرائیوں کو پالیا، جس نے ہماری سسکتی ہوئی معاشرت کے زخموں پر مرہم رکھا، ہمارے لڑکھڑاتے

Scanned with CamScanner

بوسے تمدن کو سہارا دیا اور ہمارے آئندہ عروجِ ترقی کے لامحدود امکانات کی نشاندہی کی۔ بقول گرامی ؎

دردیدۂ معنی نکہباں حضرتِ اقبالؒ

پیغمبری کرد و بپیمبر نتواں گفت

مبدائے فیاض کا نادر عطیہ کہیئے یا دنیائے شعر کی خوش قسمتی کہ اقبال کی ہمہ گیر طبیعت میں فلسفے اور شعر کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اقبال اگر شاعر نہ بھی ہوتا تو صرف اس کا تعمیری فکر ہی علمی دنیا پر ایک احسانِ عظیم ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال نے اپنے بلند پایہ خیالات کو شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے جس سے اس کا پیام دلنشیں، دلآویز، سہل فہم اور مؤثر ہو گیا ہے۔ لیکن اربابِ نظر جانتے ہیں کہ اس کی حقیقی عظمت کا راز اس کی شاعری میں نہیں، بلکہ اس کے تعمیری فکر اور عمیق تفسیرِ حیات میں مضمر ہے۔ یہ محض ایک صالح تنقید، حقائق اور واضح تنقیحِ معارف کا ثمرہ ہے کہ اقبال تاریخِ فکرِ انسانی میں ایک بلند مقام پر فائز ہے اور اقبال کو اس کا احساس بھی ہے۔ اس لئے وہ بار بار محدود معنی میں اپنی شاعری سے انکار کرتا ہے۔ اسے بار بار سطحی بینوں اور کم نظر نادان دوستوں کے خلاف احتجاج کرنا پڑا جو اُسے صرف شاعر سمجھتے ہیں ؎

آشنائے من ز من بیگانہ رفت

از خمستانم تہی پیمانہ رفت

من شکوہِ خسروی اورا دہم

تختِ کسریٰ زیرِ پائے اُو نہم!

او حدیثِ دلبری خواہد ز من

رنگ و آبِ شاعری خواہد ز من

اُسے صاف صاف کہنا پڑا ؎

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست

کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست!

وہ پہلے پہلے ایسے محدود نظر ناقدوں سے شاکی رہا جنہوں نے اُسے صرف غزل گو شمار کیا، لیکن آخری ایام میں یہ امر اس کے لئے طمانیت بخش ہوا کہ نکتہ رس اصحاب اس کا مقصد پا گئے اور اس

Scanned with CamScanner

کی شاعری کی ثانوی حیثیّت کا اعتراف کرنے لگے ۔ اب اسے ایک گونہ اطمینانِ قلب حاصل ہُوا تو اُس نے کہا ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

ہم اس مقالے میں اقبال کے ماخذوں کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں ۔ سب سے پہلے ان سطحی خیالات کی تردید ضرُوری ہے جو اقبال نافہم دماغوں کی تراوش ہیں ۔ اقبال پر عام طور پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اُس نے اپنے فلسفے کی بُنیاد یورپ کے فلاسفۂ جدید خصُوصاً مشہُور المانوی مفکّر نیٹشے اور فرانسیسی مفکّر برگسان کے افکار پر رکھی ہے ، لیکن ان مفکّرین کے افکار کا بنظرِ امعان مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت بہ دلائل قطعی ثابت ہوتی ہے کہ یہ مماثلت یا مشابہت بالکل سطحی اور معمُولی سی ہے اور اقبال بذات خُود ایک مخصُوص فلسفے کا مُخترع ہے ۔ یہاں یہ اُصولِ مسلّمہ بھی ملحُوظ رکھنا چاہیئے کہ کوئی مجدّدِ فن اپنے پیشروؤں کے خیالات سے ناآشنا نہیں رہ سکتا ۔

یہاں یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ یورپ نے اپنی نشاۃِ ثانیہ کی بنیاد بھی مُسلمانوں کے علمی ثمرات اور تحقیقات و اکتشافات پر رکھّی ۔ مشرقِ وسطیٰ اور جنُوب مغربی یورپ میں علم و عرفان کی جو شمع روشن کی گئی تھی ۔ اُس سے علمائے یورپ نے اپنے چراغ روشن کئے اور جبل الطارق کی چوٹیوں پر تہذیب و تمدّن کے جو مینار بُلند کئے گئے بھٹکتا ہُوا یورپ انہی سے صدیوں رہنمائی حاصل کرتا رہا ۔

اقبال نے اگر کہیں کہیں نبضِ مفکّرین یورپ کے حیات افروز صالح افکار سے اتفاق کیا ہے یا بنظرِ استحسان دیکھا ہے تو اس کی اصل بھی اسلامی افکار سے جا ملتی ہے ۔ مشہُور حدیث ہے ۔

اَلحِکْمَتُ ضَالَّۃُ المُؤمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا ،

" یعنی حکمت مومن کا گم شُدہ مال ہے ، جہاں اُسے مل جائے اس پر اس کا زیادہ حق ہے ۔ اس کی خوشہ چینی بھی اسلامی افکار ہی کی خوشہ چینی ہے ۔"

جن افکارِ جدید سے اقبال کے خیالات کی مماثلت پائی جاتی ہے ان میں نیٹشے کے " فوق البشر " اور اقبال کے " مردِ کامل " کا تصوّر بھی ہے ، لیکن دونوں کے خصائص میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ نیٹشے کا فوق البشر یعنی مستقبل کا اعلیٰ اِنسان ظالم و جابر ، خُود غرض اور حریص شخصیّت ہے ۔ وہ رحم ،

اخلاق، عفو و احسان کے خصائل حسنہ سے قطعاً معرّا ہے، لیکن اقبال کے مردِ کامل کے عناصر چہار گانہ میں قہاری و جبرُوت کے علاوہ قدُوسی و غفّاری بھی ہیں ؎

قہاری و غفاری و قدُوسی و جبرُوت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مُسلمان

برخلاف اس کے نیٹشے کا فوق البشر قانوُن کا پابند نہیں - اس کے عمل کا معیار صحیح ہو یا غلط، اچھا ہو یا بُرا - اس کا اندھا دُھند تصرّف و تغلّب ہے - لہٰذا نیٹشے فوق البشر کی تخلیق کو حیاتیاتی ذرائع پر منحصر سمجھتا ہے - یعنی مستقبل کا یہ اِنسان بہتر سے بہتر نسل کشی کا نتیجہ ہوگا - یہ ہوگا اِنسان کا نجات دہندہ ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

گویا نیٹشے کا فلسفہ جو اس نے اپنی کتاب ZARATUSTRA میں بزعمِ خود پیغمبرانہ انداز میں پیش کیا ہے، نسلی برتری کے گرد گھومتا ہے - اسی فلسفے کے زیرِ اثر جرمن قوم کی نسلی قومیت کے عقیدے پر ہٹلر نے تسخیرِ عالم کا منصُوبہ باندھا، جس کا حشر دُنیا نے دیکھ لیا - اقبال کا مردِ مؤمن یا مردِ کامل نیٹشے کے فوق البشر سے اجتماعی اعتبار سے افضل ہے - وہ صفاتِ جمالی اور جلالی دونوں کا حامل ہے - اس میں فقر و شاہی، جنیدی، اردشیری اور ناز و نیاز پہلو بہ پہلو موُجود ہیں - ملاحظہ ہو اس کی سیرت ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکُشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اِس کی اُمیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گُفتگو، گرم دمِ جُستجو!
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اسی طرح برگساں کے فلسفۂ زماں کا اقبال ایک حد تک موید ہے - مثلاً برگساں وقت کو ایک

خطِ مستقیم کی صُورت میں تصوّر نہیں کرتا، جسے ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جا سکے۔ وہ کسی خارجی وقت کا قائل نہیں، بلکہ وہ حقیقی وقت کا، جسے انسان اپنے ذہن کی گہرائیوں میں مستقل طور پر محسوس کرتا ہے۔ اقبال بھی اسی داخلی وقت کا قائل ہے ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

یا واضح تر الفاظ میں کہتا ہے ؎

در دلِ خود تخمِ ظلمت کاشتی　　وقت را مثلِ خطِ پنداشتی
اے اسیرِ دوش و فردا در نگر　　در دلِ خود عالمِ دیگر نگر

یہاں تک برگساں کی ہمنوائی تھی، لیکن آگے چل کر حضُور صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہُور حدیث سے جو مسئلہ زمان کی شرح کی ہے وہ اقبال ہی کا حصّہ ہے ؎

تا کجُا در روز و شب باشی اسیر
رمزِ وقت از لی مَع اللہ یاد گیر

اشارہ ہے حدیث شریف کی طرف

" لی مَع اللہ وقت لا یسعنی فیہ نبی مرسل ولا ملک مقرب"

(یعنی میرے لئے ایسا بھی ہوتا ہے جب نہ کوئی نبی میرے پاس پھٹک سکتا ہے، اور نہ کوئی مقرب فرشتہ) مراد یہ کہ اپنی اور ذات الوہیت کے سوا مجُھے کسی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وقت کی اصل حقیقت ان باطنی اور الہامی واردات پر مبنی ہے جو رُوح کی گہرائیوں سے اُبھرتے ہیں۔

نیز برگسان عقل کو ناکارہ یا نارسا سمجھتا ہے اور معرفت اشیاء کے لئے وجدان کا قائل ہے۔ اقبال بھی عقل کی ایک حد ٹھہراتا ہے، جس سے آگے یہ نہیں جا سکتی اور انتہائی صداقتوں کی منزل عشق ہی کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔

اس سرسری مماثلت سے قطع نظر اقبال نے برگسان کے عقیدۂ حیات کی مطلق العنانی، بے راہ روی اور بے مقصدیت پر کڑی تنقید کی ہے۔ برگسان نے زندگی کو بے شعُور، بے ارادہ اور بے نتیجہ

ٹھہرایا ہے ۔ لیکن اقبال نے اسے بابصر، صاحبِ شعور اور فعال بالارادہ ثابت کیا ہے ۔

یہاں تک تو ہم نے موضوع کا سلبی پہلو اختیار کیا ہے ۔ اب اس کے ایجابی پہلو پر نظر ڈالتے ہیں ۔ مفکرین اسلام میں سے اقبال نے سب سے زیادہ جس کا اثر قبول کیا وہ مولانا جلال الدین رومی ہیں ۔ وہ انہیں اپنا پیر و مرشد اور روحانی رہنما تسلیم کرتا ہے اور خلوص و عقیدت ، جذب و شوق سے ان کی ہدایت کا معترف اور ان کے روحانی تصوف کا قائل ہے ۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

پیرِ رومی آں حکیمِ پاک زاد
سرِ مرگ و زندگی بر ما کشاد
پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد !
موجم و در بحرِ او منزل کنم!
تا درِ تابندہ حاصل کنم !
منکہ مستی ہا ز صہبائش کنم!
زندگانی از نفس ہائش کنم !

اقبال پہلا صاحبِ نظر ہے ، جس نے رومی کو دیگر صوفیائے کرام سے ممیز کیا ، ورنہ اس سے پہلے وہ بھی ان ہی صوفی شعراء میں محسوب تھے جنہوں نے اسلام کی غیر اسلامی تعبیر سے اس کے اصل خط و خال کو مسخ کر دیا ۔ اقبال نے ایسے ہی تصوف پر کاری ضرب لگائی ، جس میں ایک طرف بدھ ازم کے نروان اور قدیم ہندو مذہب کی ویدانت کی منفی اقدار حیات ، مثلاً نفی ذات ، ترکِ دنیا ، فنائے ہستی ، جمود و بے عملی اور تقدیر پرستی کے عناصر شامل ہو گئے تھے ، دوسری طرف افلاطون کے خواب آور فلسفۂ اعیان کے اجزاء سرایت کر چکے تھے ۔ اقبال کی حافظ پر تنقید بھی ایسے ہی منفی اور خواب آفریں تعبیراتِ حیات کے خلاف ہے ، ورنہ وہ اس کے شاعرانہ کمال کا معترف ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ رومی نے قرونِ وسطی کی ظلمتوں میں شمعِ ہدایت روشن کی اور علی الاعلان کہا ؎

چند چند از حکمتِ یونانیاں؟ حکمتِ اسلامیاں را ہم بخواں

اور اقبال نے دانشِ حاضر کے فتنوں سے ہمیں یہ کہہ کر متنبہ کیا کہ ع

چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر!

دُوسرے بزرگ جن سے اقبال اثر پذیر ہُوا مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ ہیں، جن کے اجتہاد نے ہندوستان میں سب سے پہلے وحدت الوجُود کے خلاف وحدتِ شہُود کا فلسفہ پیش کیا۔ بالفاظِ دیگر ہمہ اوست کی بجائے ہمہ از اوست کی تعلیم دی۔ عقیدہ ہمہ اوست کا مفہُوم یہ ہے کہ تمام مظاہرِ کائنات واجب الوجُود کے عین ذات ہیں۔ یعنی باری تعالےٰ کے سوا کسی چیز کا جُداگانہ وجُود نہیں۔ اس عقیدے کی رُو سے مظاہر کا ذات الوہیّت میں سما جانا لازم آتا ہے جو حلول کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس عقیدے کے نتیجے میں اِنسان کی جُداگانہ شخصیّت صفر ہو جاتی ہے اور جبر، بے بسی اور پستی کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مجدّد الف ثانیؒ کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے، مظاہرِ قدرت ذاتِ باری تعالےٰ پر شاہدِ عادل ہیں اور اس عالم کا ذرّہ ذرّہ اُس کی ذات پر گواہی دے رہا ہے۔ اِنسان ہی اُس کی قدرت کاملہ کا مظہرِ اتم ہے اور اس ہستیٔ مافوق الادراک کی ایک رُوشن دلیل ہے۔ زندگی کے اس حرکی تصوّر سے ہمہ اوست کے خلاف ردِّ عمل پیدا ہو گیا۔ یہی سبب ہے کہ اقبال نے متعدد مقامات پر مجدّد الف ثانیؒ کی حیات پرور تعبیرِ زندگی کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

اقبال نے سب سے زیادہ قرآن و حدیث اور سنن و احکامِ شریعت کو اپنے فلسفے کی اساس بنایا ہے۔ وہ اسلامی معتقدات و اعمال کا مفسر ہے۔ تعلیماتِ اسلامی ہی اس کے فکر کے سب سے بڑے ماخذ ہیں۔ اس کی شاعری ایمان و ایقان کی شاعری ہے۔ وہ اسلامی علم و عمل کا ایک اَنتھک نقیب ہے۔ وہ مُسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا پُرسوز حدی خوان ہے۔ اس کا فلسفۂ حیات اِسلامی ذہنی ارتقاء کی ایک کڑی ہے۔ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ اس کے ذکر و فکر اور حال و قال کا محور ہیں۔ اس کے افکار، جذبات، حسیّات، اشارات و کنایات اور تلمیحات پر قرآن اور حدیث چھائے ہُوئے ہیں۔ حضورِ پاکؐ سے خطاب کرتے ہُوئے کس سوز و ساز اور خلوص و نیاز سے کہتا ہے ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآن مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کُن
ایں خیابان را ز خارم پاک کُن

Scanned with CamScanner

روزِ محشر خوار و رُسوا کُن مرا
بے نصیب از بوسۂ پاکن مرا
گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام
با مُسلماناں اگر حق گفتہ ام
در عمل پائندہ تو گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

اب ہم اقبال کے بُنیادی فلسفہ خُودی کا تجزیہ کر کے دیکھتے ہیں کہ کہاں تک ہم اور خُود اقبال اس دعوے میں حق بجانب ہے۔ لفظ خُودی اب تک غرُور و تکبّر کے معنوں میں مستعمل رہا، جو اخلاقِ رذیلہ میں سے ہیں۔ لیکن اقبال نے اس لفظ سے احساسِ ذات یا شعُورِ زندگی یا شخصیت و انفرادیت لئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صدیوں اس لفظ کی تحقیر و تذلیل ہوتی رہی۔ اس کی ذلّت و حقارت پر جسے خُود خدا لفظی و معنوی نسبت ہے، خدا کو بھی غیرت آئی۔ آخر اس نے ایک مردِ خُود دار پیدا کیا، جس نے قرنوں کے اس مطعُون و منفور لفظ کو نئے معنی بخش کر ہمیشہ کے لئے عزّت و احترام کا مستحق بنایا۔

اقبال کا یہ خیال کہ عالم افراد کا مجمُوعہ ہے۔ جس میں سے ہر ایک جُداگانہ خودی یا انفرادیت رکھتا ہے اور یہ کہ کامل ترین خودی خدائے تعالیٰ کی ہے۔ انسانی خودی اس کی ذات سے مستنیر رہی ہے۔

ارشادِ ربّانی صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (یہ اللہ کا رنگ ہے اور اللہ کے رنگ سے کون سا رنگ بہتر ہو سکتا ہے) اور فرمانِ نبویؐ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ (اللہ کے اخلاق سے اپنے آپ کو متصف کرو) پر مبنی ہے اور بخلافِ عقیدہ متصوفین کہ رُوحِ انسانی ذاتِ باری تعالےٰ میں مدغم ہو جاتی ہے۔

اقبالؔ کا یہ عقیدہ کہ جسم سے علیٰحدہ ہو جانے کے بعد بھی رُوح اپنی جُداگانہ ہستی قائم رکھتی ہے قرآنی تصوّرِ معاد کی ایک توجیہہ ہے، جس کی رُو سے بندہ و خدا، عبد و معبُود اور شاہد و مشہُود کی غیریت ثابت ہے، یا خودی کی حقیقت بیان کرنے کے بعد اس کے استحکام کے جو عوامل قرار دیئے ہیں یعنی تخلیق مقاصد اور عشق وہاں بھی اقبال نے اسلامی زندگی کا نصب العین پیش کیا ہے، ملاحظہ ہو ؎

زندگانی را بقا از مدعا است

کاروانش را ورا از مدعا است

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است

آرزو را در دلِ خود زندہ دار
تا نگر دو مشت خاکِ تو مزار

جس کا مطلب ہے کہ زندگی بے مقصد نہیں ہے ۔ قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے :۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنَاکُمْ عَبَثًا وَّاَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (کیا تم گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں عبث پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے) اور خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص زیادہ اچھا ہے)

پھر انسان کی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لئے یہ آیت کریمہ ملاحظہ ہو :۔

فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ (اللہ تبارک وتعالیٰ سب خالقین میں بہتر خالق ہے)

ذاتِ باری تعالیٰ بہترین خالق ہے ۔ اس سے دُوسرے خالقوں کا اثبات ہوتا ہے ۔ ازاں جملہ انسان بھی چھوٹے پیمانے پر ایک خالق ہے اور زندگی کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں اہمیت کا حامل ہے ۔ جو انسان تخلیقی سرگرمی سے معرّا ہے حقیقی معنی انسان نہیں ۔ چنانچہ اقبال مصر ہے ؎

ہر کہ او را لذّتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جُز کافر و زندیق نیست

اور اقبال کے عشق سے مراد جناب سرورِ کائنات کا عشق ہے ؎

در دلِ مُسلم مقامِ مُصطفیٰ است
آبروئے ما زنامِ مُصطفیٰ است
خاکِ یثرب از دو عالم خوش تر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

اس استدلال کا سرچشمہ کلامِ مجید کی اس آیت کے سوا کیا ملے گا :۔ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ

فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہ (اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبّت کرتے ہو تو میرا اتّباع کرو، تاکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبُوب ٹھہرو۔)

اقبال نے خودی کی تربیت کے جو مراحل سہ گانہ بیان کئے ہیں، ان کی اصل بھی قرآن و حدیث سے باہر نہیں ہے۔

مرحلہ اوّل، یعنی اطاعت سے مُراد اس دستورُ العمل کی اطاعت ہے جو رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اُمّت کو دیا گیا۔ اس مرحلے پر مردِ مومن مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (جس نے رسُولؐ کی اطاعت کی اُس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی) اور اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (تم اللہ و رسولؐ کا کہنا مانو اور تم میں جو لوگ اہلِ حکُومت ہیں اُن کا بھی ــــ کا مصداق ہوتا ہے ؎

تابعِ حق دید نش نادید نش
خورد نش، نوشید نش، خوابید نش

اسی جذبۂ اطاعت سے جذبۂ قربانی پیدا ہوتا ہے۔ اسی جذبہ کے زیرِ اثر حضرت خلیلؑ اللہ اپنے لختِ جگر کے گلے پر چُھری رکھ دیتے ہیں اور اسی جذبہ کے زیرِ اثر سیّد الشہدا حضرت امام حسینؑ اپنی جان، مال، اولاد اور اعزاء کی قربانی پیش کرتے ہیں۔

قرآن حکیم کی آیت کریمہ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (کہہ دیجئے میری نماز، میری ساری عبادت، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ہی کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے) کا بھی یہی مفہُوم ہے۔

مرحلۂ دوم ضبطِ نفس ہے۔ اس مرحلے پر مردِ مومن، خوفِ خدا، خوفِ مرگ اور خوفِ آلام، زمین و آسمان پر غالب آجاتا ہے اور حُبِّ مال، حُبِّ عیال اور حُبِّ جاہ کو زیر کر لیتا ہے۔ یہاں بھی اقبال توحید میں پناہ ڈھونڈتا ہے اور کہتا ہے ؎

تا عصائے لا الٰہ داری بدست
ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شُد

فارغ از بندِ زن و اولاد شُد

یہ اشعار دراصل آیات قرآنی لَا خَوفٌ عَلَیھِم وَلَا ھُم یَحزَنُونَ (نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ مغموم ہوتے ہیں) اور لَا تَخَف اِنَّ اللہَ مَعَنَا (ڈرو نہیں، اللہ تعالےٰ ساتھ ہے) کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ ضبطِ نفس کس طرح کیا جائے تو اقبال تعلیماتِ قرآن کی روشنی میں فرائض کی بجا آوری کو اس کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبادات مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ تقویٰ پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ جیسا کہ نَصِ صَرِیح لَیسَ البِرَّ اَن تُوَلُّوا وُجُوھَکُم قِبَلَ المَشرِقِ وَالمَغرِبِ (کچھ سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو، یا مغرب کو) سے ثابت ہے۔ اقبال نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے فرائض کا فلسفہ فرداً فرداً اس طرح بیان کرتا ہے ؎

لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز
قلبِ انساں را حج اصغر نماز
در کفِ مسلم مثالِ خنجر است
قاتلِ فحشا و بغی و منکر است
روزہ برجوع و عطش شب خون زند
خیبرِ تن پروری را بشکند!
وسمناں را فطرت افروز است حج
ہجرت آموز و وطن سوز است حج
حُبِّ دولت را فنا سازد زکوٰۃ
ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

مرحلۂ سوم نیابت و خلافتِ الٰہیہ ہے۔ جب مردِ مومن پہلے دو مرحلوں سے گزر جاتا ہے، تو اس مقامِ جلیل پر فائز ہو جاتا ہے اور وَلَقَد کَرَّمنَا بَنِی اٰدَمَ (ہم نے آدم کو فضیلت بخشی) اور اِنَّا عَرَضنَا الاَمَانَۃَ (ہم نے یہ امانت پیش کی) کا محل بن جاتا ہے۔ اسی مقام کی طرف اقبال اس طرح اشارہ کرتا ہے ؎

Scanned with CamScanner

نائبِ حق، ہمچو جانِ عالم است
ہستیٔ او ظلِّ اسمِ اعظم است

از رموزِ جزو و کُل آگہ بود
در جہاں قائم باامراللہ بود

پُختہ سازد فطرتِ ہر خام را
از حرم بیروں کند اصنام را

نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر
ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر

اقبال کا فلسفۂ اجتماع اسلام کے جمہوری نظام ہی کی توضیح ہے۔ اقبال سیاسین یورپ کے برعکس مذہب اور سیاست کی ثنویت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کا خیال ہے کہ اس تفریق سے فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اس دوئی کو تہذیب کی بے بصری قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

خلیفۂ وقت مسجد میں امام بھی ہے اور میدانِ جنگ میں سپہ سالار بھی۔ اجتماعی زندگی کے تمام شعبے مثلاً سیاست، صنعت، تجارت، زراعت اور معاشرت مذہب ہی تحت آجاتے ہیں ؎

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
مُلک و ملّت ہیں فقط حفظِ حرم کا اک ثمر

اقبال کے نزدیک توحید کا مطلب ہے خدا کی حاکمیّت مطلقہ کا اقرار اور قوم، نسل، وطن، وراثت، قرابت، مُلّا اور صُوفی کی اطاعت سے انکار، توحید سے قلوبِ انسانی میں ہم آہنگی، یگانگت اور اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ ایک خُدا کو ماننے کا لازمی نتیجہ ہے کہ خدا کو ماننے والی جماعت بھی ایک ہو جائے۔ اسی کو اخوّت کہتے ہیں ؎

اَسود از توحید احمر می شود
خویش، فارُوق و ابوذر می شود

ملّتِ از یک رنگی دلہا
روشن از یک جلوۂ سیناستے
مُدّعائے ما مآلِ مایکیست
طرز و انداز و خیالِ مایکیست
ماز نعمت ہائے او انخواں شدیم!
یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم

اسی طرح رسالت میں ایک اجتماعی ادارہ ہے، جس سے مراد ایک دینی قیادت کی اطاعت ہے۔ اسی اطاعت سے جماعت کی تشکیل ہوتی ہے ؎

از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما
از رسالت صد ہزار ما یک است
جُزوِ ما از جُزوِ لاینفک است

قرآن اس جماعت اور قوم کے لئے دستورُ العمل یا آئین ہے، جو ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے ؎

گر تو می خواہی مُسلماں زیستن
نیست ممکن جُز بقرآں زیستن

جس طرح ہر جماعت کا ایک مرکز ہوتا ہے، ملّتِ مسلمہ کا مرکز کعبہ ہے اور تمام دُنیا اس کا دائرہ ہے ؎

قوم را ربط و نظام از مرکزِ
روزگارش را دوام از مرکزِ

چونکہ یہ جماعت توحید و رسالت پر مبنی ہوتی ہے، اس لئے عالمگیر ہے۔ کوئی خاص مقام اس کا وطن نہیں ؎

جوہرِ ما با مقامِ بستہ نیست

بادۂ تندش بجائے بستہ است

ہندی وچینی سفالِ جام است

رُومی وشامی گلِ اندام است

قلبِ ما از ہند و رُوم وشام نیست

مرز بومِ او بجُز اسلام نیست

اقبال کے نزدیک نظامِ سیاست، جمہُوریت شخصیّت کا ایک معقول امتزاج ہے۔ وہ مغربی جمہُوریت کو ملوکیّت ہی کی نقل سمجھتا ہے ؎

دیوِ استبداد جمہُوری قبا میں پائے کوب

تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مجلس واصلاح وآئین ورعایات وحقُوق

طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

اس جگہ ایک اور غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ اقبالؔ نے سرمایہ داری کی مذمّت اور مزدُور کی حمایت میں آوازِ بُلند کی ہے، مثلاً

؎ اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر

شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

؎ اُٹھو میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو

کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

؎ خواجہ از خونِ رگِ مزدُور سازد لعلِ ناب

از جفائے دِہ خدایاں کشت دہقاناں خراب

لیکن یہ آوازِ حق رُوسی مفکّر کارل مارکس کی اشتراکیّت کی شرمندۂ احسان نہیں ہے اور اس انقلاب سے رُوسی طرز کا انقلاب مراد نہیں، بلکہ موجُودہ عدمِ مساوات کو اسلامی معاشی مساوات میں تبدیل کرنے کا جذبہ ہے۔ اقبالؔ نے رُوسی اشتراکیّت پر زبردست تنقید کی ؎

Scanned with CamScanner

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

اشتراکیتِ شکم یعنی مادی تقاضوں سے ایک قدم بھی آگے نہیں جاتی ۔ یہ انسان کے اخلاقی اور روحانی تقاضوں کی ذرا بھی تسکین نہیں کرتی ۔ کیونکہ یہ رُوحانیّت کی قائل ہی نہیں ۔ اگرچہ اخلاق کی مدعی ضرُور ہے ۔

اس لئے اقبال اسے دعوت دیتا ہے ؎

کردہ کارِ خُداوندان تمام
از مقامِ لا سوئے الّا خرام

یعنی تُو نے صرف لا تو کہا ہے ، اب الا اللہ بھی کر مشرف بہ اسلام ہو جا ۔ حقیقت یہ ہے کہ آئینِ اسلام نے ہی روحانیّت اور مادیّت کا قوامِ معتدل تیار کیا ہے اور دین و دُنیا کو اس طرح جوڑا ہے کہ کہیں جوڑ نہیں کُھلتا ؎

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نَے کوئی فغفور و خاقاں ، نَے فقیرِ رہ نشیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا اِنقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

مثنوی " اسرار و رموز " کے آخر میں اقبال نے سورۂ اخلاص کی جو شرح بیان کی ہے ، چونکہ وہ اس کی بُنیادی تعلیم کا محور ہے ، اس لئے ہم یہ مضمُون اسی کی شرح پر ختم کرتے ہیں ۔ استدلال ملاحظہ ہو کہ جب اللہ ایک ہے تو اسے ماننے والی جماعت کو بھی ایک ہونا چاہیئے ؎

با یکے ساز از دوئی بردار رخت
وحدتِ خُود را مگرداں لخت لخت

اور جب اللہ تعالیٰ " صَمَدْ " یعنی بے نیاز ہے تو مُسلمان کو بھی غیر اللہ سے بے نیاز ہو جانا چاہیئے ؎

Scanned with CamScanner

مُسلم اُستی بے نیاز از غیر شو

اہلِ عالم را سراپا خیر شو

جب اللہ کی شان "لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ" (نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی ہے تو مُسلمانوں کو بھی رنگ، خُون، گوشت و پوست پر فخر نہیں کرنا چاہیئے اور اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (تم میں سب سے بزرگ وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے) کو معیارِ شعار بنانا چاہیئے ؎

فارغ از باب او آم و اعمام باش

ہمچو سلماں زادۂ اسلام باش

حضرت سلمان فارسی سے لوگوں نے ان کا شجرۂ نسب پُوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ سلمان ابنِ اسلام! لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کا عرفان ہی اقبال سے یہ کہلواتا ہے ؎

نیست از رُوم و عرب پیوندِ ما

نیست پابندِ نسب پیوندِ ما

سب سے آخر چوں کہ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ (اور نہ کوئی اُس کے برابر ہے) اللہ تعالیٰ کی صفت ہے تو مسلمان کو بھی اپنا شریک پسند نہیں کرنا چاہیئے۔ ملّتِ مسلمہ کی شان تو یہ ہے ؎

خرقۂ لاتحزنو اندر برش

انتم الاعلون تاجِ بر سرش

سورۂ اخلاص کا تقاضا ہے کہ بندے کو مولا صفات بن جانا چاہیئے۔ اب آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اقبال کا سرچشمۂ خیال فلسفۂ مغرب ہے، یا تعلیماتِ اسلام!

Scanned with CamScanner

علاّمہ اقبالؒ

(ایک فن کار کی حیثیت سے)

شاعرِ مشرق حکیم الامت ترجمانِ حقیقت حضرت علاّمہ اقبال ہر لحاظ سے ایک جامع کمالات تشخصیت تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک بالغ نظر مفکر، ایک بلند پایہ سیاسی مدبر، ایک روشن خیال قومی رہنما اور زندگی کے زبردست نقاد تھے۔ اگر بالفرض وہ شاعر بھی نہ ہوتے تو بھی ایک مبصرِ حیات کی حیثیت سے ان کا نام تاریخ کے صفحات پر ثبت رہتا۔ لیکن ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا سب سے بڑا راز ان کی شاعرانہ عظمت اور ان کا سحر پرداز فن ہے۔ یقیناً یہ ان کے کلام کی شعریت اور کمالِ فن کا معجزہ ہے کہ ان کے عصر آفریں کلام اور ہنگامہ پرور پیغام نے قوم کے ذہن میں رسوخ حاصل کیا، اور ان کی دقیق حکمت اور عمیق فلسفہ قالبِ شعر میں ڈھل کر مؤثر، دلاویز اور دل نشیں ہوگیا۔ بلاشبہ یہ ان کی فنی چابکدستی کا کرشمہ ہے کہ وہ کتابوں کی دنیا سے نکل کر نہ صرف خواص کے دماغوں میں بلکہ عوام کے دل اور روح میں سما گئے۔ ان کی فنکارانہ عظمت پر تبصرہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم فن کی حدود متعین کرلیں، تاکہ ان کی روشنی میں ان کے فنی کمالات کا جائزہ لیا جاسکے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فن کا بنیادی عمل متاثر کرتا ہے۔ موسیقی ہو یا رقص، مصوری ہو یا شعر

Scanned with CamScanner

تمام فنونِ لطیفہ قلوبِ انسانی پر گہرا اثر پیدا کرنے کے زبردست ذرائع ہیں۔ یُوں تو سب فنونِ لطیفہ انسانی جذبات کو متحرک کرتے ہیں، لیکن جذبات کو برانگیختہ کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ فنِ شعر ہے۔ علم اور فن کا بنیادی فرق یہ ہے کہ علم صرف یقین دلاتا ہے، دماغ کو روشن کرتا ہے اور خیر و شر کی تمیز پیدا کرتا ہے۔ لیکن شعر دل کی گہرائیوں تک اُترتا ہے، رُوح کو جھنجھوڑتا ہے اور عمل و جدّوجہد پر اُبھارتا ہے۔ چنانچہ اس نازک فرق کو علاّمہ اقبال نے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

علم اگر سوزِ ندارد حکمت است
شعر میگردد چو سوز از دل گرفت

شعر کے اثر کے بارے میں تو یہ بات مانی ہُوئی ہے کہ ——

از دل خیزد بر دل ریزد

لیکن اثر پیدا کرنے کے لئے یہ ضرُوری ہے کہ معانی اور الفاظ کا چولی دامن کا ساتھ رہے۔ خیال جس قسم کا ہو اس کی مناسبت سے الفاظ کا اِنتخاب ہو۔ گہرے دقیق اور فلسفیانہ خیال کے لئے الفاظ بھی پُرشوکت ہوں اور تراکیب بھی باوقار۔ مناظرِ قُدرت کی تصویر کشی کے لئے الفاظ بھی ہلکے پُھلکے ہوں، ترکیبیں بھی سادہ اور رواں۔ جب ہم کلامِ اقبال کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اقبال نے کبھی اس فنّی اُصول سے انحراف نہیں کیا۔ انہیں انتخابِ الفاظ کا اعلیٰ درجے کا سلیقہ، مضمُون اور زبان کی ہم آہنگی کا گہرا شعور ہے۔

ان کے کلام میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ ہم اختصار کے پیشِ نظر تین مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

مرزا غالب کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہُوئے جو سنجیدہ اور باوقار لہجہ اختیار کیا ہے وہ ان اشعار سے ظاہر ہے۔

دِلّی

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر

شاہدِ مضمون تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر
آہ تو اُجڑی ہُوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

لیکن اس کے برعکس ماہ نو کی تصویر کشی کرتے وقت زبان اور لب و لہجہ نرم پڑ گیا ہے اور ہلکی پھلکی تشبیہات سے تخلیقِ حُسن کا کام لیا گیا ہے۔ مثلاً

ٹُوٹ کر خورشید کی کشتی ہُوئی غرقابِ نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے رُوئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خُونِ ناب
نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
چرخ نے بالی چرالی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

بلکہ ایک ہی نظم کے مُختلف حِصّوں میں مضمُون کی ماہیّت کے اعتبار سے لب و لہجے کا فرق محسُوس ہوتا ہے۔ اس کی مثال ان کی مشہُور نظم "گود میں بلّی دیکھ کر" میں ملتی ہے۔ چنانچہ پہلے حِصّے میں ملائمت اور ہلکا پُھلکا انداز ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :-

مارتی ہے انہیں پنجوں سے عجب انداز ہے یہ
چڑ ہے یا غصّہ ہے یا پیار کا انداز ہے یہ
شوخ تو ہوگی تُو گودی سے اُتاریں گے تجھے
گر گیا پھُول جو سینے کا تو ماریں گے تجھے

لیکن دُوسرے حِصّے میں پُر شکوہ بھاری بھرکم طرز پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ کائنات اور عشق کا موضُوع اسی کا طالب ہے ؎

سینۂ دہر میں مانندِ مئے ناب ہے عشق
رُوحِ خورشید ہے، خُونِ رگِ مہتاب ہے عشق

کہیں سامانِ مسرّت ہے کہیں سازِ غم ہے
کہیں گوہر ہے کہیں اشک کہیں شبنم ہے

ایک فطری شاعر اثر آفرینی کے جن حربوں سے کام لیتا ہے، ان میں تخیل، محاکات، ترنّم اور جذبات بہت اہمیّت رکھتے ہیں۔ تخیّل سے مُراد وہ ذہنی قوّت ہے، جو حواسِ خمسہ سے حاصل شُدہ ذخیرۂ معلُومات کو از سرِ نو ترتیب دے کر نئی صُورت میں پیش کرتی ہے۔

مثلاً چشمِ ظاہر سے دیکھے ہُوئے مناظر کو شاعر چشمِ بصیرت سے دوبارہ دیکھتا ہے اور گوشِ ظاہر سے سُنی ہُوئی صداؤں کو پھر سُنتا ہے۔ گویا اُس کا ماضی حال کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور جو لذّت اس مشاہدے اور سماعت سے حاصل ہوتی ہے وہ اسے اظہار و ابلاغ پر اُکساتی ہے اور اس طرح وہ مناسب الفاظ کے ذریعے اس کیفیّت میں دُوسروں کو بھی شریک کر لیتا ہے۔

محاکات کا مطلب یہ ہے کہ شاعر الفاظ کے ذریعے واقعات و مظاہر کی اس طرح تصویر کشی کرتا ہے کہ ہو بہو وہی تصویر سامعین یا قارئین کے پیشِ نظر ہو جاتی ہے۔ ترنّم کا مفہُوم یہ ہے کہ جن الفاظ کے ذریعے شاعر اظہارِ خیال کرتا ہے، وہ بذاتِ خُود خوش آہنگ اور لذّت بخش ہوتے ہیں۔ چونکہ الفاظ قطع نظر معنی کے اپنی صوتی اقدار بھی رکھتے ہیں۔ اس لئے انہیں اگر سلیقہ سے ترتیب دیا جائے تو سامع ان سے محظُوظ ہوتا ہے اور جذبات سے مُراد یہ ہے کہ شاعر کو جب کسی حقیقت کا شدید احساس ہوتا ہے تو وہ قارئین یا سامعین کو بھی اسی شدّت سے اس حقیقت کا احساس دلاتا ہے۔ گویا اپنی قادر الکلامی سے وہی جذبہ ان تک بھی منتقل کر دیتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبالؔ کی شاعری میں کس خوبصُورتی سے یہ عناصر جہار گانہ سموئے گئے ہیں اور ان کا عالمگیر پیامِ حیات شعریت کے کس کس سانچے میں ڈھلا ہے۔ اس لطیف حقیقت کو کہ پروردگارِ عالم کے نزدیک بندوں کی پشیمانیٔ گُناہ خود اطاعت و بندگی سے بھی زیادہ مقبُول ہوتی ہے۔ اقبال نے اپنی ابتدائی شاعری میں ایسے حسین پیرائے میں ادا کیا ہے کہ اس وقت کے کہنہ مشق اساتذہ سے بھی اپنی فنکاری کا لوہا منوا لیا۔

وہ مشہُور شعر جو اقبال کی شہرت کا سنگِ بُنیاد ہے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

یہ ایک اچھوتی تشبیہہ یعنی پسینے کے قطروں کو موتی قرار دینے کا کرشمہ نہیں ، بلکہ ایک قوی تخیل کا اعجاز ہے ۔جس کی بدولت ایک حسین مستقبل نہ صرف شاعر کے پیشِ نظر ہوگیا ۔ بلکہ وہ اپنے ساتھ ہمیں بھی اس خوبصورت دُنیا میں لے گیا ۔

جُگنو فطرت کا ایک درخشندہ گوہر تھا ہی شاعر کی قوتِ محاکات نے اسے چار چاند لگا دیئے اور لطیف تشبیہات سے ایک حقیر جاندار کو پیار کے قابل بنا دیا ۔ ملاحظہ ہو ؎

جُگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھُولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا سے
ذرّہ ہے یا نمایاں سُورج کے پیرہن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

تنہائی کی آرزو شاعر ہوں یا غیر شاعر ، اکثر لوگوں نے کی ہوگی ۔ غالبؔ نے بھی اسی تاثر کے تحت کہا تھا ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

لیکن اس ظالم تنہائی میں غالبؔ کے ساتھ جانے پر شاید ہی کوئی رضامند ہو ۔ اس کے

برعکس اقبال نے خلوت کی جو آرزو کی ہے، اتنی دلفریب اور دلآویز ہے کہ جی چاہتا ہے ہم بھی وہاں پہنچ کر اس خلوت کو جلوت بنا دیں۔ جہاں ؎

صف باندھے دونوں جانب بُوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

کلامِ اقبال میں موسیقیت کے بھی ایسے نادر نمونے ملتے ہیں، جنہیں دیکھ کر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان میں موسیقی کا بھی گہرا شعور تھا۔ مفہوم اور معنی سے قطع نظر انہیں سُن کر سماعت لطف اندوز ہوتی ہے۔ ان اشعار میں نغمگی کس قدر وجد انگیز ہے ؎

دمِ زندگی رمِ زندگی غمِ زندگی سمِ زندگی
غمِ رم نہ کر سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری
کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری

ایک غزل کے شعر سُنیے معنویت کے ساتھ سازوں کی جھنکار بھی شامل ہوگی۔

من کی دُنیا؛ من کی دُنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

اقبال کے یہاں جذبات کی دُنیا میں تو ایک محشر بپا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل کا سوز و گداز صفحہ قرطاس پر اُمڈ آیا ہے اور کتاب کے اوراق دھڑکتے دل کی دھڑکن بن گئے ہیں ان اشعار میں اصلاحی اور تعمیری جذبے کا جوش و خروش محسوس کیجئے۔

یا مُسلماں را بدہ فرمان کہ برکف بند
یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانِ آفریں
یا چناں کُن یا چنیں

اقبال کے یہاں ایجاز کا یہ عالم ہے کہ ایک ایک مصرعے میں ایسی لطیف حقیقتیں ادا ہوگئی ہیں جن کے دفتر بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ع

میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہُو

اقبال کے ہاں خاص خاص علامتیں اور اشارات پائے جاتے ہیں۔ جن سے ابلاغِ حقیقت کا کام لیتے ہیں۔ ان کی اپنی اختراع میں لالہ، شاہین، مُرغ، حرم وغیرہ، بہت معرُوف ہیں۔

ان حقائق کے پیشِ نظر بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نہ صرف مفکر، مدبر اور معلم ہیں۔ بلکہ سحر طراز شاعر اور فنکار بھی۔ ان کے افکار نے فن کا جامہ پہنا ہے تو ان کا پیغام عصر آفریں بنا ہے اور برِصغیر کے مُسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ ان کی کامیاب فنکاری کا زندہ ثبوت ہے۔

Scanned with CamScanner

اقبال کا مرکزی خیال

خُودی کو کر بُلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خُدا بندے سے خُود پُوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ترجمانِ حقیقت ، نبّاضِ فطرت ، شاعرِ مشرق ، مفسّرِ حیات - علاّمہ اقبال کا یہ شعر اِنسانی شخصیّت کی روشن تشریح ، انسانی انفرادیّت کا ایک واضح بیان اور مقامِ بندگی کی ایک بیّن تفسیر ہے - علاّمہ مرحُوم کی تمام شاعری کا نچوڑ ، تمام تعلیمات کا خلاصہ اور تمام تلقینات کا لُبِّ لُباب یہی مرکزی خیال ، یہی نکتۂ خُودی ہے - اس شعر کی شرح شاعرِ مشرق کے حیات پرور پیغام کی شرح ہے اسی ایک لفظ میں اقبال کا جہانِ معنی اور دُنیائے حقیقت مضمر ہے - یہ شعر ہمیں اقبال کی دُنیائے فراخ میں لے جاتا ہے جہاں رجائیت ہی رجائیت ہے - جہاں قنوطیّت دم نہیں مار سکتی - جہاں زندگی سانس لیتی ہے - جہاں حیاتِ جاوداں کے چشمے اُبلتے ہیں - جہاں علو و اقتدار کے سوتے پھُوٹتے ہیں - جہاں جوشِ عمل ، جوشِ کردار کے نعرے تو سُنائی دیتے ہیں ، لیکن محض گُفتار کے

Scanned with CamScanner

غازیوں کی چیخیں سُنائی نہیں دیتیں ۔ جہاں جُستجو ہے ، تگ و دو ہے ، جہد البقا ہے ؏

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے

کہنا گناہِ عظیم ہے، جہاں دل شکن، مایُوس کُن نوحے پڑھنا حرام ہے ۔ یہ وہ دُنیائے طربناک نشاط آفریں ہے جہاں اِنسانی رُوح اپنی عظمت اور شاہراہِ مستقبل کے گیت گاتی ہے ؎

سفینہ برگِ گُل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہو گا

یہ شعر اقبال کے فلسفۂ خُودی کا آئینہ دار ہے ۔ جس نے خُودی کو سمجھ لیا اُس نے اقبال کے پیغامِ عالمگیر کو سمجھ لیا اقبال کی تڑپتی ہُوئی رُوح کو دیکھ لیا ، اقبال کے دھڑکتے ہُوئے دل سے ہم آغوش ہو گیا ۔ لہٰذا ہمیں اس مُختصر سے مضمُون میں اسی خودی کا جائزہ لینا ہے ۔

لفظ خُودی اقبال سے پہلے مذمُوم معنوں میں استعمال ہوتا تھا ۔ اس سے غرُور و تکبّر، خود پرستی و خود غرضی ایسے تمام اخلاق اور عاداتِ سفلی عبارت تھے ، جن کے تصوّر سے انسان کو نفرت ہو اور جن کے ذکر سے طبیعت کو گھن آئے ، لیکن اقبال نے اس لفظ کے معنی بدل ڈالے ۔ اقبال نے اس لفظ سے خُود اعتمادی ، خُود داری اور عزّتِ نفس، ایسے اخلاق عالیہ سے لے کر انسانیّت کے بُلند مقام اور عبودیّت کے ارفع کردار تک مُراد لئے ہیں، اور صدیوں کا مکرُوہ اور منفُور لفظ ہماری عزّت و احترام کا مستحق ہو گیا ہے ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مقامِ بندگی کیا ہے ۔ عبُودیّت کا یہ بُلند معیار کون سا ہے اور انسانی شخصیّت کا یہ طرّۂ امتیاز آخر کیا ہے ، جو اقبال کا مہتم بالشّان موضُوع اور محبُوب مرکزِ خیال ہے ۔ تو سُنیے یہ مقام وہی ہے ، جس کے درد و سوز کے عوض، متاعِ بے بہا کے بدلے ہمارے خُوددار اقبال شانِ خُداوندی لینے پر رضامند نہیں ؎

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزُو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لُوں شانِ خداوندی

یہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَتَ کا مقامِ بُلند ہے ۔ یہ درجہ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ کا درجۂ ارفع اور یہ فضیلت سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی فضیلتِ مخصُوص ہے ۔ اِنسان

زمین پر خدا کا نائب ہے - خدا کا معتمد اور امین ہے، خدا کا خلیفہ ہے - یہ اُسی کے قوانینِ عالمگیر زمین پر نافذ کرتا ہے - اُس کی صفاتِ عالیہ سے اپنے آپ کو متصف کرتا ہے اور اس کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگتا ہے - اسی لئے اُسے ارشاد ہُوا ہے تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ اسی لئے تو اس کے حق میں کہا گیا ہے صِبْغَةَ اللّٰہِ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَةً -

اسلام کے نظریۂ حیات میں اِنسان ایک مجبُور اور بے بس ذات یا ایک منفی حقیقت نہیں، بلکہ معیّن اقدار کا حامل اور مثبت صفات کا امین ہے - لیکن وہ بحکمِ خدا فاعل، مختار، کائنات میں متصرف اور تخلیقی قوتوں کا مظہر ہے - علم اشیاء سے باخبر ہونا اس کا وظیفۂ حیات ہے - کائنات کی گتھیوں کو سلجھانا اس کا لائحہ عمل ہے اور عناصر کی باگ ڈور تھامنا اس کا پیدائشی حق ہے - ہوا کے جھونکے اس کے فراش، سُورج کی کرنیں اس کے باورچی اور بجلی کی لہریں اس کی پیغامبر ہیں - فطرت کی قوتوں کی تسخیر اس کی امتیازی شان ہے - آب و خاک و باد و آتش سے استخدام اس کا لازمۂ حیات ہے - اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لانا اس کا فرضِ عین ہے اور اسی لئے اُسے پیدا کیا گیا ہے اور یہی تسخیرِ کائنات خدا کے قانون کی اطاعت ہے - اس کے لئے اپنی صلاحیتوں کو صرف کرنا عبادت ہے - عناصر پر اپنی فوقیت اور اپنے آپ پر خدا کی حاکمیتِ مطلق کا اقرار ہی اسلام کا اصُولِ حیات ہے - انسانیّت کے اسی مقام کو سمجھنا اور اسے حاصل کرنا ہی مقامِ بندگی ہے -

کائنات کا عرفان، اپنا عرفان، ذاتِ خداوندی کا عرفان ہی اِنسان کامل کی صفات سہ گانہ ہیں اور جب اِنسان اس منصبِ عالیہ پر فائز ہو جاتا ہے تو انسان کی تدبیر خدا کی تقدیر کے موافق ہو جاتی ہے اور یہی انسان کو وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰہَ رَمٰى کا مظہرِ اتم بن جاتا ہے اور يَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ کا مصداقِ حقیقی بن جاتا ہے - خدا کی رضا بندے کو مطلُوب ہوتی ہے اور بندے کی رضا خدا کو مطلُوب رَضِيَ اللّٰہُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کا یہی مطلب ہے کہ ع

خُدا بندے سے خُود پُوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبالؒ اور مناظرِ قدرتؒ

ایک ترشے ہُوئے نگینے کو جس پہلُو سے دیکھیے ایک نیا رنگ جلوہ گر ہوگا اور ایک نئی آب و تاب نظر آئے گی - اس طرح علاّمہ اقبال کے ہر کلام کی ہر حیثیت اثر کشش اور جاذبیّت رکھتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ دُنیائے ہست و بُود کی طرح یہ بھی ؎

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

زندہ شاعر کا کلام زندگی کا ترجمان ہوتا ہے - زندگی کی رُوح اس کے رگ و ریشے میں اس طرح پیوست ہوتی ہے - جیسے آئینے میں جوہر و جلا اور آفتاب میں تمازت و ضیا ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

اور کلام کے جاندار ہونے کی ایک یہ بھی نشانی ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی طبیعت پر گراں نہ گزرے ، بلکہ ہر بار ایک نئی لذّت محسوس ہو -

اقبال نے کہا ہے اور کس طرح کہا ہے ، نہ صرف شاعری بلکہ فلسفہ مذہب اور سیاست

Scanned with CamScanner

کے معرکتہ الآراء مسائل ہیں۔ خداخودی ، مقامِ عبودیت ، مقصدِ حیات ، ملت و وطن وغیرہ ۔ ان کے جلیل القدر موضوعات ہیں ۔ اس مختصر مقالے میں ہم ان کی مختلف حیثیتوں سے قطعِ نظر صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اقبال کے موئے قلم نے مناظرِ قدرت کی تصویر کس طرح کھینچی ہے ۔

اس سلسلے میں اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ اقبال ماسوائے معدودے چند نظموں کے مناظر قدرت کو بطورِ پس منظر پیش کرتا ہے ، تاکہ اصل موضوع یا پیام میں ایک دلکشی اور اثر پیدا ہو جائے ۔ مثلاً گل پژمردہ کی تصویر کشی اس لئے ضروری ٹھہری کہ وہ شاعر کی اپنی افسردہ زندگی کا ترجمان ہے ؎

میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تُو

ماہِ نو سے اس لئے مخاطب ہو رہا ہے شاعر کہ وہ اس دُنیا کی تاریکیوں سے اُکتا کر روشنی کی تلاش میں ہے ؎

نور کا طالب ہُوں گھبراتا ہوں اس بستی میں مَیں

ہمالیہ کی سربفلک چوٹیاں اس کے لئے کیوں جاذبِ توجہ ہیں ۔ اس لئے کہ اس کی قدامت کا تخیل سے اُسے عہدِ قدیم میں لے جاتا ہے ۔ جب انسان سادگی اور بے تکلفی کا مجسمہ تھا اور تہذیب و تمدن کی مکاریوں سے اس کا دامن پاک تھا ؎

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سُنا
مسکنِ آبادِ انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تُو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو

اسی طرح صبح کا ستارہ اس لئے لرزہ بہ اندام ہے کہ اُسے مآلِ حُسن کی خبر مل گئی ہے اور اس سے زندگی کی بے ثباتی کا سبق ملتا ہے ؎

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند ہے جو زندگی کی مستی ہے

دو ستارے قریب آکر پھر دُور ہو جاتے ہیں، تو اِس راز کی نقاب کشائی ہوتی ہے ؎

ہے خواب ثباتِ آشنائی
آئینِ جہاں کا ہے جُدائی

دُوسرا امر جس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے یہ ہے کہ :-

اقبال مناظرِ قدرت پیش کرتے ہُوئے سائنس کے جدید ترین مسلّمات سے کبھی قطع نظر نہیں کرتا۔ زمین اور گردشِ فلک وغیرہ، ایسے ایسے قدیم معتقدات علمِ طبیعی اور ماہیت کی تلمیحات مذہب شاعری میں اگرچہ جائز ہیں، لیکن اقبال کی جدّت طرازی نے تازہ ترین نظریات کو بعض اشعار کی بُنیاد قرار دیا ہے۔ مثلاً چاند کا زمین کے گرد پھرنا ؏

طوفِ حریمِ خاکی تیری قدیم خُو ہے

چاند کا آفتاب سے روشنی حاصل کرنا ؏

تو سراپا سوز داغِ منّتِ خورشید ہے

علیٰ ہذا القیاس زحل کو زنار بند کہتا ہے جو اس سیارے کی صحیح تصویر ہے۔

اب رہا ہمارا اصل موضوع کہ اقبال نے عروسِ فطرت کی مشاطگی کا حق کس طرح ادا کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس حُسنِ لطافت، حُسنِ بیان اور اختصار سے مناظرِ قدرت کا نقشہ اس نے کھینچا ہے۔ یہ بات بہت شاعروں کے حصّے میں آئی ہے۔ اگرچہ انتخاب مشکل ہے، مگر چند اقتباسات دے کر اور وہ بھی اُردو کلام میں سے چند تصویریں پیش کی جاتی ہیں ؎

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھُومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صُورت اُڑا جاتا ہے ابر

ندّی کی تصویر ملاحظہ ہو ؎

آتی ہے ندّی فرازِ کوہ سے گاتی ہُوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہُوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہُوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہُوئی

Scanned with CamScanner

چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مُسافر دِل سمجھتا ہے تری آواز کو

دامنِ کوہ میں جو ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنایا ہے اس کی فضا دیکھنے کی چیز ہے ؎

صف باندھے دونوں جانب بُوٹے ہرے ہرے ہوں
ندّی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کے سویا ہُوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جُھک جُھک کے گل کی ٹہنی
سُرخی لئے سُنہری ہر پُھول کی قبا ہو
دیکھئے ماہِ نو کس طرح نمُودار ہوتا ہے ؎
ٹُوٹ کر خورشید کی کشتی ہُوئی غرقابِ نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے رُوئے آبِ نیل
طشتِ گردُوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خُونِ ناب
نشترِ قُدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
چرخ نے بالی چُرا لی ہے عرُوسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

جُگنو فطرت کا ایک درخشندہ موتی تھا ہی شاعر کے تخیّل نے اسے اور چمکا دیا ؎

جُگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پُھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ

یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

کنارِ راوی پر شام کا نظارہ دیکھئے ؎

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام
لئے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلۂ روزِ تیز گام چلا
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا

کلی کس طرح کھلتی ہے ؎

سامنے مہر کے دل چیر کے رکھ دیتی ہے
کس قدر سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے

دریائے نیکر کے کنارے شام کا منظر وجد کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے ؎

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کے سو گئی ہے

Scanned with CamScanner

کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا

ذرا ستارے سے آنکھیں چار کیجئے ؎

قمر کا خوف ہے یا خطرۂ سحر تجھ کو
مآلِ حُسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو
متاعِ نور کے لُٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو
ہے کیا ہراس فنا صورتِ شرر تجھ کو
زمیں سے دُور دیا آسماں نے گھر تجھ کو
مثالِ ماہ اڑھائی قبائے زر تجھ کو
غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے

اب دیکھئے تاروں کی محفل کس طرح سجتی ہے ؎

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو — طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور — قدرت نے اپنے زیور چاندی کے سب اُتارے
محفل میں چاندنی کی لیکن ظلمت آئی — چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے

خضرِ راہ میں ساحلِ دریا پر ایک رات کا منظر ایسا منظر ہے جس پر دُنیائے شعر کو بجا طور پر ناز ہے۔ مصوّر کا موقلم بھی ایسی تصویر کشی سے عاجز ہے ؎

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب

شب سکوت افزا ہُوا آسُودہ دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں محوِ خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجمِ کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب

اور خضر کی زبانی صحرا کی دلفریبیوں کا منظر محاکاتی شاعری کا شاہکار ہے ؎

رات کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ خضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہُوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل
اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنّت میں گردِ سلسبیل

سرِدست ہم انہی اقتباسات پر اپنا مقالہ ختم کرتے ہیں۔ کیونکہ ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حُسنِ تو بسیار
گلچینِ تو از تنگیٔ دامانِ گلہ دار

Scanned with CamScanner

اِقبالؔ کی شاعرانہ حیثیتیں

ہم اس مقالے میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کے چند راز مُختصراً بیان کریں گے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صدی کے اس عظیم شاعر کے متعلق بُنیادی حقائق چار ہیں :-

- اقبال شاعرِ حیات ہے ۔
- اقبال شاعرِ اسلام ہے ۔
- اقبال شاعرِ انقلاب ہے ۔
- اقبال شاعرِ مستقبل ہے ۔

پہلی حیثیت شاعرِ حیات

سینکڑوں سال کی اُردو شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالئے ۔ ہمیں کہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے ۔ ولی دکنیؔ سے غالبؔ تک دیکھ جایئے ۔ درد ، سوز ، گداز ، حسرت ، عبرت ، یاس ، بلکہ موت تک ملے گی ، لیکن زندگی نہیں ملے گی ۔ پیامِ حیات اور رُوحِ اُمید نہیں ملے گی ۔

اقبال پہلا شاعر ہے جس نے زندگی کے گیت گائے اور رجائیت کے نغمے چھیڑے ۔ بانگِ درا سے ارمغانِ حجاز تک ، مصرع مصرع میں وہی ولولہ ، وہی تڑپ وہی جذبۂ عمل اور

Scanned with CamScanner

وہی جوشِ پیکار نظر آئے گا۔ قوتِ عمل کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے جس کی آغوش میں ہزاروں طوفان اور جس کی ہر موج میں پیامِ زندگی ہے ؎

ساحلِ اُفتادہ گفت گرچہ بسی زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موجِ زخود رفتۂ تیز تر خرامید گفت
ہستم اگر می رُوم گر نہ روم نیستم

اقبال سلامت برکنار است کا قائل نہیں، بلکہ کشمکشِ امواج ہی میں حیاتِ جاوداں کا راز دیکھتا ہے اور کہتا ہے ؎

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

ذرا اُس شاعری اور اِس شاعری کا فرق ملاحظہ ہو۔ کہاں موت کی وہ چیخیں کہ سینکڑوں سال سے دماغوں کو ماؤف کر رہی تھیں ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ آیا تو کدھر جائیں گے

اور اس قسم کا بزدلانہ خوف یا ؎

کے توانم دید ساقی جامِ صہبا بکشند
مے پر در نگم حبابی گر بدریا بکشند

اور کہاں زندگی کے یہ نغمے اور اُمید کی یہ لہریں ؎

سفینۂ برگِ گُل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہو گا

اور زندگی کا یہ بصیرت افروز اور تعمیری نظریہ ؎

Scanned with CamScanner

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ

جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جُوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

اقبال کے نزدیک زندگی کوئی ساکن اور جامد چیز نہیں، بلکہ ہمیشہ رواں دواں، متحرک، مضطرب اور ارتقاء پذیر ہے۔ زندگی ازل سے ابد تک ایک سیلِ بے پناہ، اوّل سے آخر تک ایک چشمۂ جاری اور ابتدا سے انتہا تک ایک بحرِ بیکراں ہے۔ یہ بن نہیں چکی بلکہ بن رہی ہے اور بنتی رہے گی۔ موالید ثلاثہ سفرِ زندگی کے مختلف مرحلے ہیں اور صبح و شام، روز و شب اس کے بڑھتے ہوئے قدم ہیں۔ آفتاب و ماہتاب، ستارے اور سیارے، زمین و آسمان، ارواح و عناصر۔ غرض کائنات کا ذرّہ ذرّہ زندگی کی برق رفتاری کا مظہر ہے۔ اس طرح زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی جاتی ہے۔

چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

ہر شے مُسافر ہر چیز راہی
کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی

زندگی کا یہ حرکی تصوّر اقبال کی سب سے بڑی خصوصیّت ہے۔ اقبال پہلا شاعر ہے جس نے زندگی کی یہ حقیقت واشگاف کی ہے ؎

سکُوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

یہ زندگی ہی تو ہے جو سینۂ سنگ میں شرر بن کر پھُوٹتی ہے۔ محفلِ نبات میں رنگ و بُو بن کر بہتی ہے اور قلبِ انسانی میں امنگیں اور ارمان بن کر دھڑکتی ہے۔

سب سے پہلے اقبال کی عمیق نظر زندگی کی اس متحرک وحدت پر پڑی اور اس نے مبنی پر حقیقتِ دعوے کر کے علمی دنیا کو چونکا دیا ؏

لہُو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

لیکن وہ ورڈز ورتھ کی طرح عالمِ فطرت میں اِنسان کو مدغم نہیں کر دیتا - اس کے ہاں انسان اشرف المخلوقات کی بُلندیوں سے سبزہ وگل کی پستی پر کبھی نہیں اُترتا اور کائنات کا یہ خلاصہ اور زندگی کا یہ نچوڑ سمٹ سمٹا کر محض ایک چیز بن کر نہیں رہ جاتا بلکہ اس کے برعکس وہ انسان کو تمام مظاہرِ زندگی سے برتر، ممتاز اور متصرف قرار دیتا ہے ، کیونکہ انسان خدا کی بنائی ہوئی کائنات میں نظمِ حُسن اور تربیت پیدا کرتا ہے اور خدا کی بخشی ہُوئی تخلیقی اور تعمیری قوّتوں کو بروئے کار لا کر اس دنیا کو حسین اور جمیل تر بنا دیتا ہے ، چنانچہ محاورہ خدا اور انسان میں اقبال نے اسی نمایاں حیثیت کی طرف لطیف اشارہ کیا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کوہسار و راغ آفریدم
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

ان حقائق کی روشنی میں کیا یہ دعوے درست نہیں کہ زندگی کے ایسے مبصر اور کائنات کو اس عمیق نظر سے دیکھنے والے صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں -
جیسا کہ اُس نے خود کہا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نُوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

دُوسری حیثیت شاعرِ اسلام

فلسفۂ اقبال کا بُنیادی اور مرکزی خیال نظریۂ خُودی ہے - جس طرح قائدِ اعظم کے نام کے ساتھ پاکستان کا نام زبان پر آتا ہے، اسی طرح اقبال اور خُودی کا ذکر لازم و ملزُوم ہیں - حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے ذاتِ باری تعالےٰ ، کائنات اور اِنسان کے جو مقامات متعین کئے ہیں اقبال نے

اپنے فلسفہ خودی میں انہی مقامات کی تشریح کی ہے۔
چنانچہ وہ تمثیل پیش کرتا ہے ؎

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن
عالم ایں شمشیر را سنگِ فسن

یعنی انسان زمین پر خدا کا نائب خلیفہ یا امین ہے۔ اسے شمشیر کہا گیا ہے۔ کائنات، آئینِ الٰہی کا محل ہے اور انسانی شخصیت خودی کی نشو و نما اور ارتقاء کے لئے ایک سازگار ماحول بھی۔ اسے سنگِ فساں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ چونکہ انسانی خلقت کا مقصدِ اعلیٰ صرف قانونِ الٰہی کا نفاذ ہے اور انسان اس مقصد کے لئے حق تعالےٰ کا آلہ کار ہے۔ اس لئے شمشیر زن حقیقت میں حق تعالےٰ ہے اور آیہ شریفہ کا یہی مطلب ہے۔ نفاذِ حکم کے لئے نہایت ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ کو صفاتِ باری تعالیٰ سے متصف کرے۔ آیہ کریمہ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً سے بھی یہی مقصود ہے اور حدیث تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ سے بھی یہی مراد ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اسلامی عقائد خارجی اثرات سے یکسر پاک ہو جائیں۔ اس لئے انہوں نے عجمی تصوّف پر ضرب کاری لگائی۔

تصوّف پر وحدانیت کا اثر ہو یا نہ ہو جیسا کہ جرمن مفکر وان کریمر کا خیال ہے اور بدھ ازم کی چھاپ بھی ہو یا نہ ہو، جیسا کہ ہارنن کا قیاس ہے، لیکن اس پر نیو پلیٹونزم یعنی افلاطونیت جدیدہ کا اثر تاریخی شواہد سے مسلّم ہے۔ اس لئے اقبال نے افلاطون کے فلسفہ گوسفندی اور حافظ کی خواب آور شاعری پر بڑے زور کے حملے کئے ہیں، چنانچہ اسرار و رموز میں افلاطون کے متعلق صاف صاف کہتا ہے ؎

آہوا ش بے بہرہ از لطفِ خرام
لذتِ رفتار بر کبکش حرام
شمش از طاقتِ رم بے نصیب
طائرش را سینہ از دم بے نصیب
ذوقِ روئیدن نہ داند دانہ اش

از تپیدن بے خبر پروانہ اش

حقیقت یہ ہے کہ اقبال جہاد کا پیمبر ہے اور یہ لوگ پستی، فرار، بے عملی اور بے اعتدالی کے خطیب ہیں۔ وہ چنگ و رباب کی شاعری کو قوموں کے حق میں سمِ قاتل سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس سے بادشاہ محمّد شاہ رنگیلے اور واجد علی شاہ تو پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن طارق، خالد، محمّد بن قاسم اور سُلطان ٹیپو ایسے مجاہد ہرگز پیدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

من آں علم و ہُنر را با پرکاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

اس سلسلے میں اقبال نے سیاستِ مغربی کا راز بھی طشت از بام کیا ہے، جو مذہب و سیاست میں ایک حدِ فاصل قائم کرتی ہے۔

اقبال نے بتایا کہ اسلام میں سیاست مذہب سے علیٰحدہ نہیں، بلکہ مذہب ہی کا ایک شعبہ ہے، بلکہ مذہب کو سیاست سے جدا کرنے کے نتائج بہت خطرناک ہوتے ہیں ؏

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

وہ جنیدی اور اردشیری کو ایک ہی مردِ مومن کی ذات میں مجتمع دیکھنا چاہتا ہے اور مذہب و سیاست کی دوئی کو چشمِ تہذیب کی بے بصری قرار دیتا ہے۔

سب سے بڑی دلیل جس کی بنا پر ہم اسے شاعرِ اسلام کہتے ہیں، یہ ہے کہ اس نے مُسلمانوں کو اسلامی اخوّت کا بھُولا ہُوا سبق یاد دلایا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اہلِ مغرب نے عقیدۂ وطنیّت کی تلقین کچھ اس انداز سے کی کہ اقوامِ مشرق ان کے فریب میں آکر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں اور رشتۂ وحدت جو وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَلَا تَفَرَّقُوْا سے عبارت ہے، ٹوٹ کر رہ گیا۔ قوموں کو جغرافیائی تصوّرات کے حُدود میں مقید کر کے اسلامی جذبۂ اخوّت سلب کر لیا گیا اور صیّادانِ مغرب کو ان پراگندہ اقوام کا شکار کرنا آسان ہو گیا۔ اقبال نے اہلِ مغرب کے اس دام کو توڑا اور ڈنکے کی چوٹ پر کہا کہ اسلام زمین پرستی نہیں خدا پرستی سکھاتا ہے۔ ایک ایرانی مسلمان کو دارا و جمشید کی اولاد یا وادیٔ الوند میں پیدا ہونے پر فخر نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ دینِ اسلام کی قدرِ مشترک یعنی کلمہ

توحید اس کا سرمایۂ افتخار ہونا چاہیئے، جو ہندی، پاکستانی، افغانی، ایرانی، رُومی، شامی، عربی اور مصری مُسلمان کا اُصولِ حیات ہے۔ اقبال نے اسلامی اخوّت کا ساز اس جوش و خروش سے چھیڑا کہ ایک مصری مُسلمان کا دل ایک چینی مُسلمان کے دل کے ساتھ ساتھ دھڑکنے لگا۔ چنانچہ یہ قطعہ اس جذبے کا ترجمان ہے ؎

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخ ساریم
تمیزِ رنگ و بُو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

اور یہ مصرع بھی اسی نظریے کا عکاس ہے ؏

تو اے مُرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

تیسری حیثیّت شاعرِ انقلاب

انقلاب سے مُراد وہ اساسی تغیرّات ہیں جو جامعۂ انسانی کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات کو بہتر بنانے کے لئے بُروئے کار لائے جائیں، تاکہ استعمار کی جگہ حُریّت، استحصال کی جگہ استقلال اور نامنصفانہ اقدار کی جگہ منصفانہ اقدار نے لے لیں۔ اس معنی میں بھی اقبال اسلامی نشاۃ ثانیہ کا پیشرو ہے، جو انسانی حرّیت و مساوات کا سرچشمہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مفکرّین اپنے افکار کے بیج قوموں کے اذہان میں بو دیتے ہیں۔ جہاں وہ پرورش پاتے رہتے ہیں۔ پھر سیاسی لیڈر انہی افکار پر اپنی تحریکوں کی بُنیاد رکھ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر انقلابِ فرانس کے بانی والٹیر یا روسو سپائر نہیں تھے بلکہ روسو تھا، جس کی تحریروں نے لیڈروں کو اس کے لئے تیار کیا۔ اسی طرح انقلابِ رُوس کے بانی لینن یا ٹراٹسکی نہیں تھے، بلکہ مارکس کی انقلابی تلقینات کی وہ چنگاریاں تھیں جو اس کی مشہور کتاب سرمایہ کے نام سے سُلگ رہی تھیں۔ اس معنی میں ہم اقبال کو آزادیٔ وطن کا بانی قرار دے سکتے ہیں، کیونکہ اس کے افکار نے ہندو پاکستان کی آزادی کے لئے زمین تیار کی۔ سب سے پہلے اس نے غلامی

Scanned with CamScanner

کی مکروہ تصویر کھینچ کر قلوب کو اس سے متنفر کیا، مثلاً

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرِ داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوارتر است
من ندیدم کہ سگِ پیش سگے خم کرد

پھر کہتا ہے ؎

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجہ از برہمن کافر تری

دوسری جگہ آزاد و غلام کا موازنہ اس طرح کیا ہے ؎

ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہم دوش
وہ بندۂ آفاق ہے یا خواجۂ آفاق

پھر خضرِ راہ میں غلامی اور آزادی کا فرق اس طرح بیان کیا ہے ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

بلکہ ایک اور قدم آگے بڑھاتا ہے اور مغربی جمہوریت کو بھی غلامی ہی کی ایک صورت قرار دیتا ہے ؎

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

جمہوریت کے پردے میں بھی استبداد ہی کی ایک جھلک نظر آتی ہے، چنانچہ کہتا ہے ؎

اگر تاجِ کئی جمہور پوشد
ہماں ہنگامہ ہا در انجمن است
نماند نازِ شیریں بے خریدار
اگر خسرو نہ باشد کوہکن است

وہ اسلامی نظامِ حیات کو از سرِ نو نافذ کرنا چاہتا ہے ۔ اسی سرچشمے سے حقیقی آزادی و مساوات کے دریا بہتے ہیں اور اسی معنی میں وہ ایک اِنقلابی شاعر ہے ۔ وہ اشتراکی عروج کو بھی جو آج دُنیا میں مدعیِ مساواتِ انسانی ہے ، اسلام کے مکمّل روحانی اور مادّی انقلاب کی طرف دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے ؎

بگذر از لاجانبِ الآخرام

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس جامع ، مادی اور رُوحانی انقلاب کی دعوت پر صرف مادی انقلاب کے داعیوں کا ردِّ عمل کیا ہے ۔

چوتھی حیثیت شاعرِ مستقبل

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ بعض مفکّرین و مصلحین کے دل و دماغ اپنے معاصر کے دل و دماغ کی نسبت بہت ارفع و اعلیٰ ہوتے ہیں ۔ اس لئے ان کے ثمرات ، فکر و نظر ، معاصرین کی فہم و فراست سے بالاتر رہتے ہیں اور انہیں اس سطح تک پہنچنے کے لئے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے ۔ ایسے مفکّرین یا مصلحین کے متعلق یہ کہنا بجا ہوتا ہے کہ وہ وقت سے پہلے پیدا ہُوئے ہیں ۔ اقبال کو بھی اس حقیقت کا احساس ہے ، چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

نغمہ ام از زخمہ بے پروا ستم
من نوائے شاعرِ فرداستم
اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشمِ خود بر بست و چشمِ ما کشاد

اقبال سے پہلے غالب نے بھی اس قسم کی پیش گوئی کی تھی ؎

شہرتِ شہرم بگیتی بعدِ من خواہد شُدن

یعنی میری سوسائٹی میرے افکار کی سطح تک نہیں پہنچ سکی ۔ یہ خواب مستقبل میں شرمندۂ تعبیر ہوگا ۔ چنانچہ یہ پیشگوئی حرف بحرف درست ثابت ہوگی ۔ غالبؔ کے معاشرے کی کور ذوقی

ہے انیسویں صدی میں ذوق ایسے شاعروں کو اُن کا مدِ مقابل سمجھ لیا گیا - اس غالب کو آج بیسویں صدی میں دُوسری زندگی ملی ہے - اقبال کو بھی اس قسم کے کوتاہ بینوں سے گلہ ہے، جو اسے صرف شاعر سمجھتے ہیں اور اس کے پیامِ عالمگیر سے بے بہرہ ہیں، جس پر اس کی عظمتِ جاودانی کی بُنیاد ہے - چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

آشنائے من ز من بیگانہ رفت
از خمستانم تہی پیمانہ رفت
کم نظر بیتابیٔ جانم نہ دید
آشکارم دید و پنہانم نہ دید
من شکوہِ خسروی او را دہم
تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد ز من
رنگِ آبِ شاعری خواہد ز من

آنے والے واقعات کا عکس اس صفائی سے اس کے ذہن پر پڑتا ہے کہ وہ آئینۂ حال میں عکسِ مستقبل دیکھ لیتا ہے اور پیغمبرانہ انداز میں پیش گوئی کرتا ہے ؎

دیکھ لینا سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی
نالۂ صیّاد سے ہوں گے نواسامانِ طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اقوامِ مشرق کی بیداری اور استعمارِ مغرب سے آزادی کی کامیاب تحریکیں جو آج ہمارے سامنے سرخرو ہُوئی ہیں، اُن کی ایک جھلک شاعر کی چشمِ بصیرت نے بہت پہلے دیکھ لی تھی - اسی طرح

مغرب کی تہذیب و تمدّن کی نامنصفانہ قدروں کی شکست بھی آئندہ نسلیں دیکھ لیں گی اور شاعر کا یہ خواب بھی کہ ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

ایک نہ ایک دن شرمندۂ تعبیر ہو کر رہے گا - اس لئے ہم بلاخوف و تردّد کہہ سکتے ہیں کہ اقبالؒ ماضی کا نقاد، حال کا مبصّر اور مستقبل کا پیغامبر ہے - وہ ایک بڑا مفکّر، بہت بڑا مصلح اور ایک بہت بڑا محبِّ انسانیّت ہے - ضرورت ہے کہ دُنیا اس کے پیغامِ عالمگیر کو سمجھے اور شاعر کے مشورے پر عمل کرے کہ ؎

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

اقبالؒ کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز

انیس برس کے بعد آج پھر شاعرِ مشرق، حکیم الامّت، ترجمانِ حقیقت حضرت علاّمہ اقبالؒ کی یاد تازہ ہو رہی ہے اور اُن کی انیسویں برسی پر ہم انہیں خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ فطرتاً ہمارے ذہن میں یہ خیال اُبھرتا ہے کہ اس عظیم شخصیّت نے قوم کو کیا پیغام دیا اور کس رنگ میں دیا — آج جب کہ اہلِ نظر اپنے اپنے رجحانات کے مطابق اس صدی کے مفکرِ اعظم کی زندگی اور فن کے متعلق سوچ رہے ہیں، محسُوس کر رہے ہیں اور اظہارِ خیال کر رہے ہیں تو اس سوچ میں، اس احساس میں اور اس اظہارِ خیال میں ہمارا بھی حصّہ ہے، ہمارا بھی ایک خاص نقطۂ نظر ہے، ایک مخصُوص رجحان اور مخصُوص ردِّ عمل ہے۔ حضرت اقبال زندۂ جاوید ہیں اور قرنوں کے لئے زندۂ جاوید! اُن کی زندگیٔ جاوداں کا راز، اُن کی زندگی آموز شاعری میں مضمر ہے اور اُن کی شاعری اُن کے پُرجوش پیغامِ یقین و عمل کی مرہُونِ منّت! اقبال کبھی موت کی مرثیہ خوانی نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ زندگی کے گیت گاتے ہیں۔ اُن کے ہاں رجائیت ہی رجائیت ہے، قنوطیّت کا نشان تک نہیں ملتا۔ اُن کی شاعری یقین، عزم، عمل اور کردار کی شاعری ہے۔ وہ ان انسانی اُمنگوں، اُمیدوں اور آرزوؤں

Scanned with CamScanner

کی ترجمانی کرتے ہیں جن سے قوم کا مستقبل تعمیر ہوتا ہے جو کاروانِ ملّت کی منزلِ عمل متعیّن کرتی ہیں۔ انہوں نے اِنسانیت کے بُلند مقام کی نشان دہی کی ہے۔ اُن کے نغموں میں ملّت کا دِل دھڑکتا ہے۔ اُن کی شاعری صحیح معنوں میں عصر آفریں ہے۔ ہمارا موجُودہ علمی، ادبی، سیاسی اور ثقافتی ماحول براہِ راست اُن کے افکار کی پیداوار ہے۔ انھوں نے قوم کو ایک واضح نصبُ العین بخشا ہے اور ہماری مذہبی، قومی اور معاشرتی منزلِ مقصُود کے نشانِ راہ متعین کئے ہیں۔

ہر زمانے میں عام طور پر یہ خیال پیدا ہوتا رہا ہے کہ ذوقِ شعر اور ذوقِ عمل دو متضاد صفات ہیں اور شعرأ میں بالخصوص قدرے عمل کا فقدان ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ زندگی کی دوڑ میں نہ صرف خُود ناکام رہتے ہیں بلکہ اُن کی تلقینات قوم میں بھی غفلت، جمُود، بے راہ روی اور بے قاعدگی ایسے رجحانات پیدا کر دیتی ہیں اور شاید اسی نظریے کے تحت افلاطُون نے اپنی مثالی حکومت کے ڈھانچے میں شاعر کو جگہ نہیں دی تھی۔ لیکن فکرِ اقبال کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو اس مفروضے کی عمارت ہی زمین پر آ رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی ترقی اور تعمیر کی بُنیاد اقبال ایسے شاعروں کے بُلند افکار، زندگی آموز اشعار اور صحت مند شاہکاروں ہی پر استوار ہوتی ہے۔ زندگی کی دوڑ میں بڑھنے والی قومیں، اَوجِ ترقی پر پرواز کرنے والی قومیں اور صفحۂ ایّام پر عزم و عمل کی مہریں ثبت کرنے والی قومیں اقبالؔ ایسے شاعروں کی تعلیم کو جذب کر کے ہی آگے بڑھ سکتی ہیں اور اُن کے اشارات کو مشعلِ راہ بنا کر ہی سرگرمِ عمل ہوتی ہیں اور ان کی ترقی کا معیار اسی قدر اونچا ہوتا ہے جس قدر بُلند پایہ شاعر کا کلام ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال کا کلام جس نے قوم کے صالح جذبات کو اُبھار کر راہِ عمل پر گامزن کیا، محض گفتار نہیں بلکہ خود ایک کردار ہے، خُود ایک کارنامۂ عزم و عمل ہے، جس سے قومی ترقی کے پُرجوش سوتے پھُوٹتے ہیں اور جو قوم کے احساسات میں خُون زندگی بن کر رواں دواں ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقبال کو فن کی افادیّت، معاشرے میں شاعر کی اہمیّت اور بُلند پایہ شاعری کے تاثر کا پُورا احساس ہے۔ چنانچہ انھوں نے متعدد مقامات پر اس جذبے کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی!
برہمن زادۂ رمز آشنائے رُوم و تبریز است

اور وہ مشہور قطعہ بھی اسی جذبے کا ترجمان ہے، جس میں وہ اپنی شاعری کو قوم کے اتحاد اور یک جہتی کا ایک ذریعہ قرار دیتے ہیں، مثلاً

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم، ناقۂ بے زمام را

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اَور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں جو سُنّتِ شعرا سمجھی جاتی ہے اور نہ غیر ذمّہ دارانہ ادّعا، بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس پر وقت کی رفتار نے مُہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔

اقبال فن برائے فن کے قائل نہیں، وہ فن کو زندگی کا ترجمان ہی نہیں سمجھتے بلکہ زندگی کی ترقی اور تعمیر کا ایک بڑا مؤثر ذریعہ بھی مانتے ہیں۔ اُن کے نزدیک فن صرف تفریحی قدریں ہی نہیں، بلکہ اصلاحی، تعمیری اور انقلابی قدریں بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ ان اشعار سے ان پر روشنی پڑتی ہے ؎

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا!
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
بے معجزۂ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا؟

اور حقیقت یہ ہے کہ زندگی، اِنسان اور معاشرے سے الگ ہو کر فن اپنا مقصد کھو بیٹھتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

شاعر اندر سینۂ ملّت چو دل
ملّتِ بے شاعرے انبارِ گِل!
شعر را مقصود گر آدم گر است
شاعری ہم وارث پیغمبر است

شاعر اور معاشرے کا باہمی تعلق ان اشعار سے واضح ہے ؎

شاعرِ دل نواز بھی بات اگر کہے کھری

ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری
اہلِ زمیں کو نسخۂ زندگی دوام ہے
خونِ جگر سے پرورش پاتی ہے جو سخنوری!

اِن اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال محض شاعرانہ جذبے کی تسکین کے لئے تفریحاً شعر نہیں کہتے بلکہ اُن کے پیشِ نظر ایک مخصوص اندازِ فکر، ایک متعین عقیدہ اور ایک مربوط نظامِ حیات ہے ۔ انہیں شعر کی افادی قدروں کا گہرا شعور ہے ۔

کلامِ اقبال کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ براہِ راست تلقینِ عمل نہیں کرتے بلکہ اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے کے لئے متعدد اشاروں اور استعاروں سے کام لیتے ہیں، مثلاً مذہب کو عشق یا جنوں سے فلسفے کو عقل، خرد یا دانش سے، رسمی علوم کو خبر سے، مشاہدے کو نظر سے، مادی اقتدار کو اردشیری سے اور روحانی قوت کو جنیدی سے استعارہ کرتے ہیں ۔ اسی طرح لالۂ صحرائی، شاہین، عرب، عجم وغیرہ بیسیوں استعارے ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں اور اُن کے کلام کے تاثر کا راز اسی اشاریت میں مضمر ہے ۔ چنانچہ جب وہ یہ کہتے ہیں ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

تو اس سے مراد ایمان و کفر کی آویزش ہوتی ہے اور جب وہ یہ انکشاف کرتے ہیں کہ ؎

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللہی وہی مرحبی وہی عنتری

تو اس سے اُن کا اشارہ معرکۂ حق و باطل کی طرف ہوتا ہے جو ہر زمانے میں رہا ہے ۔ اگر کفر و ایمان اور حق و باطل کے الفاظ استعمال کئے جاتے تو وہ تاثر پیدا نہ ہو سکتا جو چراغِ مصطفویؐ، شرارِ بولہبی، اسد اللہی، مرحبی اور عنتری کے اشارات سے ہُوا۔

اسی طرح جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ؏

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بُنیاد!

توعصا مادی شوکت واقتدار کا مظہر ہوتا ہے اور کلیمی روحانیت کا نشان بن جاتی ہے۔ کلامِ اقبال کی اس اشاریت اور رمزیت میں وہ تاثر اور تبلیغی قوت ہے جو براہِ راست الفاظ کے سپاٹ پن سے ممکن نہیں۔

اقبال کے کلام کا بیشتر حصّہ حرکت وعمل، تگ ودَو، جستجو، جدّوجہد، کوشش وکار، تنازعِ البقا، جفاکشی اور مشکل پسندی کے گرد گھومتا ہے۔ یہی وہ موضوعات ہیں جو اُن کے کلام میں وحدت، ہم آہنگی اور انفرادیت پیدا کرتے ہیں۔

یہی وہ دریائے ناپیدا کنار ہے جس سے زندگی اور توانائی کی موجیں اُبھرتی ہیں، مثلاً

دمِ زندگی رمِ زندگی، غمِ زندگی سمِ زندگی!

غمِ رم نہ کر سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر وغنا نہ کر

کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

وہ عمل کو زندگی اور بے عملی کو موت قرار دیتے ہیں۔ مثلاً

اِس رہ میں مقام بے محل ہے

پوشیدہ قرار میں اجل ہے

اور مثلاً

موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو

گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے

لذّتِ پیکار اور نشاطِ جدوجہد اُن کے احساسات کا محور ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

میرا بزم بر ساحل کہ آنجا

نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش درآویز

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

وہ کعبے کا سفر اس لئے نہیں کرتے کیونکہ راہ بے خطر ہے او اس راہ پر کبھی قدم نہیں رکھتے جس

میں کوہ و دشت و دریا حائل نہ ہوں ؎

بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفاطلبی است
سفر بہ کعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر است

مرید ہمتِ آں رہرو دم کہ پانہ گزاشت!
بہ جادۂ کہ درآں کوہ و دشت و دریا نیست!

اُن کے نزدیک عمل نہ صرف اس زندگی کا مقام متعین کرتا ہے بلکہ معاد کی تشکیل بھی اسی پر منحصر ہے۔ چنانچہ ان کا مشہور فلسفیانہ شعر ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی!
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔ وہ جزا و سزا کو بھی قیامت پر مبنی نہیں سمجھتے، بلکہ یہ دُنیا ہی دارِ مکافات ہے، جہاں لمحہ بہ لمحہ اعمال کا احتساب ہوتا ہے اور ہر وقت اعمال پر جزا و سزا مرتب ہوتی رہتی ہے ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

چونکہ عمل کی بُنیاد یقین پر ہوتی ہے، اس لئے انہوں نے جا بجا یقین کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ چنانچہ ان اشعار میں اسی کی تلقین اور تاکید ہے ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قُدرت تو زباں تو ہے!
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے!

گُماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مُسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر رُوحُ الامیں پیدا

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں!
ولایت ، بادشاہی ، علمِ اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں ، فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال یقین و عمل سے مُراد کیا لیتے ہیں - یقین سے اُن کی مُراد وہ ابدی صداقتیں ہیں جو اسلام کے اُصولِ حیات اور مردِ مومن کا جُزوِ ایمان ہیں اور وہ ہیں کائنات، خالقِ کائنات اور انسان کی اپنی خودی کا عرفان ، ——— عمل سے مُراد انسان کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایک صالح معاشرے کی تشکیل ہے ، جس میں فرد اور جماعت کے حقوق محفُوظ ہوں اور قوامِ دین و دُنیا معتدل ہو - یقین و عمل کا یہ حسین امتزاج ہی تو ہے جس میں اِنسان کا انفرادی کردار بنتا ہے اور یہی تو وہ آگ ہے جسے اقبال کے نفس نے تیز تر کر دیا ہے - انہوں نے اپنی سحر آفریں حدی خوانی سے ناقۂ قوم کو راہِ ترقی پر گامزن کیا - اسی حجازی لَے سے وطن کے غفلت کدوں میں بیداری کا صور پھُونکا - اسی سازِ یقیں کی دُھن پر مُسلمانوں کے دلوں میں ایک نیا شعُور پیدا کیا اور اسی کی بدولت ان کا پیغام اس برِصغیر میں ملّتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کا پیش خیمہ بنا - حضرت گرامی جالندھری نے اس حقیقت کی طرف کس قدر خُوب صُورت اشارہ کیا ہے ؎

در دیدۂ صاحب نظراں حضرتِ اقبال
پیغمبریٔ کرد و پیمبر نتواں گفت

بر دوشِ ہوا کا ایک مکالمہ :
۲۱ اپریل ۱۹۵۷ء کو ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے نشر ہُوا

Scanned with CamScanner

تشریح و تضمین ـ زخمہ و ساز

Scanned with CamScanner

پیش حرف

زخمہ بھی آپ کے سامنے ہے اور ساز بھی ۔ اقبال کا ساز اپنے مصرعوں کے زخمے سے چھیڑا ہے تو زخمے پیدا ہو گئے ہیں ۔ حسین و جمیل کہوں تو خود ستائی ، دِشت و زبوں کہوں تو کسرِ نفسی ! دلدوز و جگر گداز ہیں تو اور بہشت گوش و سامعہ نواز ہیں تو فیصلہ سامعین کے ذوقِ سلیم پر ہے ۔ مجھے کچھ اور عرض کرنا ہے ۔

جب سے ہوش سنبھالا ہے اقبال مست ہُوں ، بادۂ اقبال پیتا بھی رہا ہُوں پلاتا بھی رہا ہُوں ۔ نہ صرف لب پہ کلامِ اقبال ہے بلکہ رُوح کی گہرائیوں میں پیامِ اقبال پیوست ہے ۔ اقبال سے شغف آج سے نہیں برسوں سے ہے اور اس والہانہ عقیدت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا اور اب تو یہ حال ہے کہ بار بار پڑھتا ہُوں اور سیری نہیں ہوتی ، دل کہتا ہے اَور ، اَور ؎

فیض ساقی شبنم آسا ، ظرفِ دل دریا طلب
تشنہ دائم ہُوں آتش زیرِ پا رکھتا ہُوں میں

اقبال جو خُود عالمگیر ، جس کا پیام عالمگیر ، مشرق کے حرم میں جس کی نوائے روح پرور سے سامعہ نواز مغرب کے آذر کدے جس کی صدائے خلیلی سے لرزہ براندام ، جس کی فغانِ شوق دل وجود کو چیر کر بارہا عالم ملکوت و جبروت تک پہنچی ہے ۔ فرشتوں نے بارگاہِ ایزدی میں بارہا پستی کے اس مکیں کی شوخی و بے باکی کا شکوہ کیا ہے ۔ اس زندہ و پائندہ اقبال کی شاعرانہ اور مفکرانہ عظمت کا سکہ اگرچہ اربابِ نظر کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے ، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس قلندرِ اعظم کے اسرار و رموز کو ہم میں سے کتنے ہیں جو کما حقہٗ سمجھتے ہیں ۔

اِن رازہائے سربستہ کی نقاب کُشائی اور اس پیامِ حیات افروز کی شرح و تفسیر وقت کا اہم تقاضا ہے ۔

Scanned with CamScanner

چند سال سے یہ کام جاری ہے۔ مُلک کے اچھے اچھے ادیب یہ ادبی، قومی و ملّی خدمت اپنے اپنے طرز پر سرانجام دے رہے ہیں۔ میری تضمینوں کی اشاعت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

سمجھ کر سمجھانا بھی ایک کام ہے۔ نثر میں وہ جادو کہاں جو نظم میں ہے۔ اپنا اپنا ڈھنگ ہے اور اپنا اپنا رنگ، اپنی دانست میں کام کیا ہے۔ نام سے غرض نہیں۔ ترجمہ و تضمین سعیٔ نامشکور ہے تو ہو۔ تشکر و امتنان کی حرص مذہبِ عشق میں کفر کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ خدا کرے کہ یہ سعیٔ نامشکور ہی رہے۔ اخلاص جزا سے بے پروا ہے۔

دوزخ میں ڈال دے کوئی لاکر بہشت کو

داد نہیں نہ سہی، بیدادگروں کی تسکین کا سامان تو ہو جائے گا۔ جستہ جستہ مقامات سے اقبال پر معدودے چند اور بھی تضمینیں نظر آئی ہیں، لیکن نکتہ شناس جانتے ہیں کہ رُوحِ اقبال کو جذب کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ؎

ہر بُوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اَب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اگر میری تضمینوں سے کلامِ اقبال کی تشریح و تفسیر و توضیح کا مقصد بوجہ احسن ادا ہوا ہے اور میرے مصرعوں کی رُوح مرحُوم کے مصرعوں کی رُوح میں مصداق۔ مَن تو شُدم تو مَن شُدی۔ مدغم ہوئی ہے تو دعائے خیر سے یاد فرما کر اہلِ نظر کی آبرو رکھ لیں ؎

اثر کرے نہ کرے سُن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

آغا صادق

Scanned with CamScanner

تعارف

علامہ اقبال کے متعلق ، اُن کی تقلید میں یا اُن کے افکار سے متاثر ہو کر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا ۔ اقبال زندگی کا ترجمان ہے اور جب تک ہم زندگی کے طوفانوں سے کھیلتے رہیں گے وہ ہمارے لئے روشنی کے ایک مینار کا کام دیتا رہے گا ۔ یہ علم و عرفان کا وہ سرچشمہ ہے جس تشنہ لب اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے یہ وہ مشعل ہے جس سے نت نئے چراغ روشن ہوں گے !

ایک محفل میں پاکستان کے وسائل کے متعلق بحث ہو رہی تھی ۔ جب حاضرین میری طرف متوجہ ہوئے تو میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا کہ پاکستان کا سب سے بڑا سرمایہ " اقبال " ہے ۔ کوئی قوم اُس وقت تک قلاش نہیں ہوتی جب تک اُس کے فکر میں پستی نہیں آجاتی ۔ جب دلوں میں زندگی کے ہنگامے سرد ہو جاتے ہیں تو زرعی اور معدنی وسائل کام نہیں دیتے !

اقبالؒ کا پاکستان یقیناً دنیا کا خوشحال ترین ملک بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ زندگی کی وہ شاہراہ جس پر بانگِ درا ، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کے چراغ روشن ہیں ۔ پاکستان کے قافلے کو ہر نئی صبح ایک نئی منزل کی طرف بلاتی رہے گی !

اقبالؒ کے کلام کو ہر پاکستانی کے کانوں تک پہنچانا ہمارا اوّلین فرض ہے ۔ دریا موجود ہے ، زرخیز مٹی کو سیراب کرنے کا کام باقی ہے !

" زمزمہ و ساز " آغا صادق کی اُن تضمینوں کا مجموعہ ہے ، جو اُنہوں نے اقبال کی بعض غزلیات اور منظومات پر لکھی ہیں اور مجھے اُمید ہے کہ اس کاوش کو اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ سمجھا جائے گا !!

(نسیم حجازی)

Scanned with CamScanner

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

کلمہ طیبہ کیا ہے؟ اقرار الوہیت و رسالت۔ خودی کیا ہے؟ مقامِ عبودیت کا عرفان مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ خودی خدا کے نور سے مستنیر رہتی ہے اور اپنی جداگانہ ہستی بھی برقرار رکھتی ہے۔ اقبال کی تعلیم کا مرکزی خیال یہی ہے۔ بخلاف خیال صوفیائے سلف کہ خودی یعنی انسانی انفرادیت ذاتِ خداوندی میں مدغم ہو جاتی ہے۔ یہ نظم حقائق کلمہ طیبہ کی ترجمان ہے۔

تضمین

خودی کی روحِ رواں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ — خودی ہے تیر کماں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
خودی کا حسنِ بیاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ — "خودی کا سرِّ نہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
خودی ہے تیغ فساں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

زمانہ احمدِ بے میم کی تلاش میں ہے — "جہاں نجات کی تعلیم کی تلاش میں ہے
یہ وقت عدل کی تقویم کی تلاش میں ہے — یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

ضرر رساں ہے یہ جنسِ شعور کا سودا — فریب دے گا تجھے مکر و زور کا سودا
ظلام کو تو سمجھتا ہے نور کا سودا — "کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ"

Scanned with CamScanner

عیال و خویش و اقارب یہ دُختر و فرزند — ترے بُلند تخیّل کے واسطے ہیں کمند
فنا پذیر صدا در گرہ ہیں مثلِ سپند — "یہ مال و دولتِ دُنیا یہ رشتہ و پیوند
بُتانِ وہم و گماں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ"

بشر کی عقل ہے وہم و گُماں کی زُنّاری — طلسمِ بُود و نبود جہاں کی زنّاری
کبھی زمیں کی کبھی آسماں کی زُنّاری — "خرد ہُوئی ہے زمان و مکاں کی زُنّاری
نہ ہے زمان و مکاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ"

نہیں ہے وقت کا آہنگ دلنشیں پابند — ہَوا ہے نالۂ دِل نے کا بھی کبھی پابند؟
کہاں ہیں رنگ و نسب کے اُصولِ دیں پابند؟ — "یہ نغمہ فصلِ گُل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ"

خلُوص و مہر کہاں دھر کے مکینوں میں — ریا کے نقش نمایاں ہیں ان جبینوں میں
چھُپے ہیں مکر و دغا گرچہ اِن کے سینوں میں — "اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مُجھے ہے حُکمِ اذاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ"!

Scanned with CamScanner

اوجِ خودی

مقامِ خودی کی بلندی کیا کہنا! مشیّت ایزدی تک بندے سے اس کی طالب ہے۔ اس مقامِ عبودیت کا طربناک بیان علامہ اقبال کی اِس غزل میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہی خصوصیت تضمین کے پیرائے میں اس کی ؎ اس کی تفسیر و توضیح کی محرک ہوئی۔

اِس موقع پر یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ نیٹشے اور اقبالؒ بڑی حد تک ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اقبال مومن کو کمالِ انسانیت قرار دیتا ہے، لیکن نیٹشے اپنے فوق البشر کا جو تخیل پیش کرتا ہے وہ اقبال کے مردِ مومن کے تخیل سے مختلف ہے۔ نیٹشے قہر و جبروت، تندی و تیزی اور چنگیزیت کا سبق دیتا ہے۔ لیکن اقبال کوہ و بیاباں سے سیلِ تند رو بن کر گزر جانے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہاں گلستانِ محبت میں جوئے نغمہ خواں ہونے کا درس بھی دیتا ہے۔ اسلام نیٹشے سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ اسلام ہٹلرازم سے۔

تضمین

مکان و لامکاں کیا ہے فنا کیا ہے بقا کیا ہے
مرا مقصود امکاناتِ فردا کے سوا کیا ہے!
مجھے ماضی کے افسانوں سے آخر واسطہ کیا ہے
"خرد مندوں سے کیوں پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے،
کہ میں اِس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے"

اسیرِ ناز بزمِ بے نیازی میں اگر پہنچے
مقامِ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ تجھ کو مل جائے
تعلق عبد اور معبود میں اتنا تو ہونے دے
"خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے"

Scanned with CamScanner

جہان آفرینش مفتخر ہے میں وہ جوہر ہوں — صفاتِ ہُو کا محرم ہوں جمالِ حق کا مظہر ہوں
چراغِ بزمِ اُلفت کا گدازِ رُوح پرور ہوں — "مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں
یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے؟"

دلِ عاشق کی صورت میں بڑی پہنائیاں اس میں — قیامت زا محبت کی حسیں انگڑائیاں اس میں
زمیں فرسائیاں اس میں فلک پیمائیاں اس میں — "نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں
نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے وہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے"

اگر نیٹشے چلا آتا مرے اسرار خانے میں — حقیقت کا مزا پاتا مرے رنگیں فسانے میں
کوئی مشکل نہ پیش آتی اُسے عرفان پانے میں — "اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے؟"

کسی کی کج نگاہی نے جگر خوں کر دیا میرا — نوا پردازِ راہی نے جگر خوں کر دیا میرا
یہاں تو بے گناہی نے جگر خوں کر دیا میرا — "نوائے صبحگاہی نے جگر خوں کر دیا میرا
خُدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے؟"

Scanned with CamScanner

"جہاں تیرا ہے یا میرا"

عبُودیت میں بھی ایک شانِ بے نیازی پیدا ہوجاتی ہے، جو دراصل ذاتِ الوہیّت کی بے نیازی ہی کی مظہر ہوتی ہے اور اس کیفیّت کے وقت خطاب کا تیکھا پن رعنائیوں کا پیکرِ جمیل بن جاتا ہے ۔ اس لئے اِس غزل میں بھی شکوے کی سی آن بان پیدا ہوگئی ہے ۔

عاشق متلون مزاج ہوتا ہے ۔ چاہنے والا کبھی تسلیم و رضا کا مجسمہ ہوتا ہے اور کبھی اضطرار و اضطراب کا شعلۂ جوّالہ! شاعر دُنیا کی حالت پر مطمئن نہیں، تو اس اطمینان کے حصُول کے لئے سراپا استفسار بن جاتا ہے ۔ اے باری تعالیٰ آخر ایسی صُورتحال کیوں پیدا ہُوئی اور کیا تو بھی اِس پر مطمئن ہے ۔ شاعر کو تو یہ ایک آنکھ نہیں بھاتی ۔ پھر بھولے پن سے بے تعلقی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اچھا یُوں ہی سہی ۔ مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو؟ حالانکہ اسے بھی فکرِ جہاں ہے جبھی تو شکایت کا انداز پیدا ہوا ؎

محبّت سے شکایت کا بہت گہرا تعلق ہے
محبّت جس قدر ہوگی شکایت بیشتر ہوگی (آغا صادق)

صوفیائے کرام کے ہاں بھی ایسے اقوال پائے جاتے ہیں، جس کے ظاہری الفاظ قابلِ گرفت ہوتے ہیں، لیکن اِن کا گہرا مفہوم شدید جذبۂ اخلاص کا پہلو لئے ہُوئے ہوتا ہے ۔ اِصطلاح میں ایسے اقوال کو شطحیات کہتے ہیں ۔ اقبال بھی کبھی کبھی اس وادی میں آنکلتے ہیں، مثلاً ع —— یزداں بکمند آور اے ہمّتِ مردانہ —— انہی شوخیوں کی مغدرت بھی پیش کرتے جاتے ہیں ؎

رمزیں ہیں محبّت کی گستاخیٔ و بے باکی
ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذبہ نہیں بے باک

اصل میں تحیّر و استفسار کا یہ جذبہ بے پناہ حصُولِ اطمینان چاہتا ہے، جس طرح موحدِ اوّل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چاہا تھا ۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے اس سوال کے جواب میں کہ کیا تجھے میری قُدرت میں شک ہے؟ ارشاد ہوتا ہے کہ "وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ" یعنی میں پوچھ کر اپنے دل کا اطمینان چاہتا ہُوں!

Scanned with CamScanner

تضمین

ازل سے تا ابد سکّہ رواں تیرا ہے یا میرا؟ زمیں تیری ہے یا میری زماں تیرا ہے یا میرا
بھٹکتا پھر رہا یہ کارواں تیرا ہے یا میرا؟ "اگر کجرو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو؟ جہاں تیرا ہے یا میرا؟

زبانِ حال سے کہتی ہے گلشن کی زبوں حالی صبا کی کم نگاہی سے ہوئی پھولوں کی پامالی!
بتا کس نے یہاں بے التفاتی کی بنا ڈالی؟ "اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی!
خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا؟"

شرارت ہمسرِ شانِ ربوبیت ہوئی کیونکر؟ کرے یوں سرکشی تجھ سے اُسے قدرت ہوئی کیونکر؟
بغاوت آشنا ابلیس کی فطرت ہوئی کیونکر؟ "اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر؟
مجھے معلوم کیا وہ راز داں تیرا ہے یا میرا؟"

اِسی اِنسان کے دَم سے ہے بزمِ کُن فکاں روشن! حریمِ آفتاب و ماہتاب و کہکشاں روشن!
فلک تاباں ملک شاداں مکیں خُرّم مکاں روشن! "اِسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن!
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟"

الستی انجمن میں دلنشیں پیمان بھی تیرا ہدایت کے لئے تنزیل کا احسان بھی تیرا
شبِ معراج وہ فخرِ بشر مہمان بھی تیرا "محمدؐ بھی ترا جبریلؑ بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟"

Scanned with CamScanner

ساقی

رازو نیاز بے پناہ جذبات کا اظہار جو ساقی سے خطاب کر کے کیا گیا ہے علم کی کوتاہیوں اور عشق کے اعجاز کا دلآویز بیان ہے ۔ اقبال نے اور بھی کئی مقامات پر عقل و عشق کا موازنہ کیا ہے تو عشق ہی کا پلّہ بھاری رہا ہے ۔ چنانچہ بانگِ درا میں عقل و دل کے عنوان سے جو نظم ہے اس میں دل کی زبانی کہتے ہیں ؎

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
علم تجھ سے معرفت مجھ سے
تو خدا جو خدا نما ہوں میں

اسی قسم کی گفتگو مشہور صوفی ابوسعید ابوالخیر رحمتہ اللہ علیہ اور مشہور فلسفی بوعلی سینا میں حقیقتاً ہوئی ہے، جسے ہم اس موقع پر من و عن درج کرتے ہیں ۔ حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے علماً اور عرفاً دو مختلف ذریعے اختیار کرتے ہیں علماً کا طریقہ شریعت ہے اور عرفاء کا طریقت ۔ ایک کی منزل ہے علم اور دوسرے کی یقین ۔ سُنا ہے کہ ایک محفل میں دونوں بزرگ جمع تھے ۔ فلسفی نے صوفی سے کہا کہ جو آپ دیکھتے ہیں میں جانتا ہوں ۔ صوفی نے جواب دیا کہ آپ صرف جانتے ہیں میں دیکھ لیتا ہوں ۔ اِس میں شک نہیں کہ اقبال عقل کو بھی ایک حد تک انسان کی رہنمائی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں ۔ لیکن عقل کا ایک مقام ہے جس سے آگے اس کے پر جلتے ہیں ۔ مکمل رہنمائی عشق ہی کا حصّہ ہے ۔ کیونکہ حقائق کا صرف مان لینا ہی کافی نہیں، ان سے محبت بھی ضروری ہے ۔ عقل خام ناتمام اور خود غرض ہے ۔ عشق کامل مخلص اور ایثار پیشہ ہے ۔ عقل اندازوں اور تخمینوں میں پابجولاں ہے اور عشق وسوسوں سے آزاد اور اقدام لسند! ؎

Scanned with CamScanner

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

تضمین

پھر لبِ شوخ پہ کچھ تازہ کلام اے ساقی ! پھر نگاہوں سے کوئی مست پیام اے ساقی !
پھر وہ مستانہ سا اندازِ خرام اے ساقی ! "لا پھر اک بار وہی بادۂ جام اے ساقی !
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی"

حسرتِ بادہ میں جلتے ہیں جگر مثلِ سپند تا بکے رِند رہیں ہوش و خرد کے پابند !
تجھ کو دیتا ہوں تری شانِ کرم کی سوگند ! "تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند !
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی"

پارسائی نے کیا مائلِ بیداد گری چشمِ زاہد میں کھٹکتی ہے مری شانِ خودی
آہ یہ تنگدلی ہائے رے یہ سنگدلی ! "میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے وہ بھی حرام اے ساقی"

خوئے تقلید سے اسلام کی صورت بگڑی دین کی تیشۂ الحاد نے کی بیخ کنی !
علم و عرفاں کے گھرانوں میں جہالت پھیلی ! "شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی"

آج وہ خوبیٔ کردار اڑا لی کس نے ؟ مجھ سے وہ لذتِ پیکار اڑا لی کس نے ؟
سنتِ حیدرِ کرار اڑا لی کس نے ؟ عشق کی تیغِ جگردار اڑا لی کس نے ؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی"

عشق صادق ہو تو دلسوز ہیں شاعر کے نکات قصۂ شوق کا ہر لفظ ہے اک شاخِ نبات
جذب و اخلاص سے ہے قندِ مکرر ہر بات "سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی"

Scanned with CamScanner

مستیٔ چشمِ گراں خواب سے محروم نہ رکھ
ڈوبنے دے مجھے غرقاب سے محروم نہ رکھ

ہاں مئے ناب مئے ناب سے محروم نہ رکھ
"تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ

تیرے میخانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی!"

Scanned with CamScanner

شرق و غرب

مشرق و مغرب کی نارسائی اور دامانِ گی کا فرق شاعر کی نگاہِ نکتہ بیں میں قطعاً غیر متعصبانہ ہے۔ مشرق کی گمراہیاں اور قسم کی ہیں، مغرب کی اور قسم کی۔ شاعر کی فطرتِ حساس دونوں کی نبض شناس ہے۔ وہ دونوں کو کھری کھری سُنا رہا ہے۔

مشرق و مغرب کی ذہنیت کا تفاوت افراط و تفریط کے دو غلط پہلو لئے ہوئے ہے اور یہ دونوں ضدیں ہمارے اعتدال پسند شاعرِ حیات کو گوارا نہیں۔ مشرق زیادہ تر رہبانیت کی طرف مائل رہا ہے۔ دیدانت، بُدھ ازم اور عیسائیت کے رجحانات ترکِ دُنیا کی ایسی منفی اقدارِ حیات میں پناہ لیتے رہے ہیں۔ ایران میں ثنویت اور عرب میں اسلام نے ضرور حیات افروز مثبت اقدار کی تلقین کی۔ مثلاً اوّل الذکر اُصولِ زندگی نے خیر و شر کا جو تصور پیش کیا، اس میں کثرتِ اولاد، زمین اور بیش از بیش استحصالِ رزق کو موجبِ خیر و برکت اور اہرمن کی خوشنودگی کا سبب قرار دیا اور موخر الذکر نے بحکم لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی، تسخیرِ فطرت کی تاکید کی، لیکن اِن تلقینات پر کہاں تک عمل ہُوا۔ دونوں مذہب جلد ہی افلاطون کے فلسفۂ اعیان اور دیدانت کے زیرِ اثر بے عملی جمود و تعطل اور کشمکشِ زندگی سے فرار اور انفعالی شکست خوردگی کا شکار ہو گئے، وہاں بھی عملی زندگی کی چنگاریاں خاکستر میں تبدیل ہونے لگیں اور یہاں بھی اسلام کا جذبۂ مجاہدانہ خانقاہی سلسلوں میں مقید ہو کر رہ گیا۔

اُدھر مغرب جو ہر چیز کو تاجرانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کا خوگر ہے، افراط کی اس حد پر جا پہنچا جہاں معاوضہ ہی معاوضہ ڈالر ہی ڈالر، ناپ ہی ناپ اور تول ہی تول ہے۔ لیکن مہر و مروّت، شفقت و احسان، عفو و حلم کا نشان تک نہیں۔ زندگی کے ہر شعبے کو انتفاعی نقطۂ نظر سے دیکھنا ایسا غلط طرزِ عمل ہے، جسے کوئی متوازن اور سلیم الطبع انسان ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔

ہمارا شاعرِ حیات تو مادے اور رُوح کے امتزاج اور سختی و نرمی کی متناسب ہم آہنگی میں نجاتِ عالم دیکھتا ہے۔ اس کی شاعری تو مصاف زندگی میں سیرتِ فولادی اور شبستانِ محبت میں حریر و پرنیان کی دوگونہ فضاؤں میں سانس لیتی ہے اور اس کا قافلۂ فکر و عمل تو کوہ و بیاباں میں سیل تند رو ہو کر اور گلستاں میں جوئے نغمہ خواں ہو کر گزرتا ہے۔

Scanned with CamScanner

تضمین

وہاں تعقّل کا خمکدہ ہے یہاں جنُوں کا شراب خانہ — وہاں ہے تدبیر کا فسوں اور یہاں ہے تقدیر کا فسانہ
وہاں ہیں تہذیب کی ادائیں یہاں ہر انداز وحشیانہ — "ضمیرِ مغرب ہے تاجرانہ ضمیرِ مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ یہاں بدلتا نہیں زمانہ"

یہ صُوفیائے کرام یعنی رہِ طریقت کے تیز راہی — جبیں پہ داغِ سجُود ہیں جنکی پارسائی پہ اک گواہی
رہِ عداوت پہ گامزن ہوں یہ کم نگاہی یہ کم نگاہی — "حریف اپنا سمجھ رہے ہیں مجُھے خدایانِ خانقاہی
انہیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگِ آستانہ"

بنائے ایماں ہے نامکمّل اگر ہے ذوقِ عمل سے عاری — اگر نہیں کش مکش کا جذبہ تو دُور ہے منزلِ ترقی
خبر نہیں کس نے اس کو بتلائے بخت و قسمت کے لغو معنی — "خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی یا خود فریبی؟
عمل سے فارغ ہُوا مُسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ"

غلام قومیں جو کارزارِ حیات سے گرگسیں کنارا — رہا ہے ان کے لئے تو لے دیکے اک تصوّف کا اب سہارا
کمال ذلّت ہے گر غلامی کا ننگِ پستی کریں گوارا — "غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا
زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے فضائے گردوں ہے بیکرانہ"

چمن کا محرم مجُھے سمجھتا ہے کوئی اپنا ہو یا پرایا — صبا نے میری چمن پرستی کا گیت ہر پھُول کو سُنایا
نہ میں نے سبزے سے بیر رکھا نہ میں نے کانٹوں کا دل دکھایا — "مری اسیری پہ شاخِ گُل نے یہ کہہ کے صیّاد کو رُلایا
کہ ایسے پُرسوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجُھ پہ آشیانہ"

Scanned with CamScanner

گیسوئے تابدار

نیاز کی سجدہ فرسائیوں کے ساتھ ساتھ ناز کی سرفرازیاں بھی قابلِ دید ہوتی ہیں اور فی الواقع یہ عشق غیور ہی کا حصّہ ہے کہ سپُردگی و والہیّت میں بھی عزّتِ نفس کا پہلُو بچائے رکھتے ع

حُسن ہے مست ناز اگر تو بھی جواب ناز دے!

اقبال کی خودی حُسنِ مطلق میں مدغم نہیں ہوتی بلکہ اپنی جُداگانہ ہستی برقرار رکھ کر اس کے نُور سے مستنیر ہوتی ہے جیسے ایک ذرّہ آفتاب سے کسبِ نور کرتا ہے، لیکن اپنا جداگانہ وجُود بھی رکھتا ہے بخلاف صُوفیائے کرام جو نفی ذات کے قائل ہیں۔ اقبال کا عقیدہ ہے کہ انسانی ذات ایک وحدت ہے اور ہستیٔ باری تعالیٰ بھی ایک وحدت۔ دونوں وحدتوں کے اشتراک و ادغام سے حلول واجب آتا ہے۔ لہٰذا انسانی کمال یہی ہے کہ اپنی جداگانہ خودی قائم رکھتے ہُوئے صفاتِ باری تعالیٰ اپنے اندر جذب کرے، نہ کہ خُود باری تعالیٰ کے اندر جذب ہو جائے۔

فی الواقع ایک مثالی انسان کا ظہُور جو صفاتِ الٰہیہ سے متصف ہو، ذاتِ خداوندی ہی کا ظہُور ہے، اس لئے انسان کو بحیثیّت مظہرِ ذاتِ الٰہی ہونے کے جو شرف و امتیاز حاصل ہے وہ بھی موجبِ صد افتخار بن جاتا ہے۔ کسی نے کیا خُوب کہا ہے ع

ترا بندہ ہُوں اور کرتا نہیں دعوےٰ خُدائی کا

انسان کی یہ بے نیازی خدا کی بے نیازی کا عکس ہوتی ہے چنانچہ میں نے ایک ساقی نامہ میں کہا تھا ؎

زمانے بھر سے مری بے نیازیاں تو بہ
سما گئی ترے رندوں میں تیری خُو ساقی

اقبال پر اس وقت یہی کیفیت بے نیازی چھائی ہُوئی ہے اور اسی ترنگ میں وہ ایسی شوخی و بے باکی پر اُتر آتا ہے جہاں مُحبت آشنا سطحی نظریں اُسے گستاخی کی سرحد پر دیکھتی ہیں، لیکن یہ مُحبت ہی کی سرشاری و مدہوشی ہے جس میں ڈُوب کر ایسی باتیں نکل جاتی ہیں۔ بندہ فنا فی اللہ ظاہر کی گرفت سے بے پروا ہو کر نہ جانے

Scanned with CamScanner

کیا کیا کہہ جاتا ہے - اسی قبیل سے ہیں یہ مصرعے ع کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر
اور ع آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

تضمین

جلوۂ برق پاش سے طور کو شرمسار کر — تیرِ نظر چلا کوئی قلب و جگر پہ وار کر
حجلۂ غیب سے نکل زلفِ دوتا سنوار کر — "گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر
عقل و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر!"

منتظرِ جمال کی جان ہے کس عذاب میں — جلوہ گاہ گاہ سے شوق ہے اضطراب میں
پردہ بہ پردہ حُسن کی دید ہے کس حساب میں — "عشق بھی ہو حجاب میں حُسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر!"

تیری ہی مجھ کو جستجو، تیری ہی مجھ کو آرزو — تیرے سحابِ فیض سے کشتِ حیات کی نمو!
ذرّۂ کمپرس میں مہرِ جہاں فروز تُو — "تُو ہے محیطِ بیکراں میں ہوں ذرا سی آبِ جُو!
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر!"

برقِ جمال رکھ لے اب تابِ نظر کی آبرُو — گوشۂ چشمِ التفات! زخمِ جگر کی آبرُو
اشک سحر سے ہے مرے دیدۂ تر کی آبرُو — "میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرُو
میں ہوں خذف تو تُو مجھے گوہرِ شاہوار کر!"

دامنِ لالہ زار اگر میرے نصیب میں نہ ہو — صوتِ شرارہ بار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
زمزمۂ ہزار اگر میرے نصیب میں نہ ہو — "نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر!"

بحرِ جلال و قہر میں ایک بھنور اُٹھا تھا کیوں؟ — جوشِ غضب میں "اِهبِطُوا" تو نے مجھے کہا تھا کیوں؟
ایسا بھی کیا گناہ تھا مجھ سے خفا ہُوا تھا کیوں؟ — "باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر!"

Scanned with CamScanner

مان لیا گُناہ میں حد سے گیا ہُوں میں نِکل　　شرّ و فساد سے مرے تیرے جہاں میں ہے خلل
آ رہی رہے گی ایک دن موت کا ہے وقت اٹل　　"روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر!"

Scanned with CamScanner

"فرمانِ خداوندی"

وقت کی پُکار اور زمانے کی آواز کیا ہے؟ مختاریٔ مجبُور اور آزادیٔ جمہُور، حُریّت فرد و عزّتِ نفس کا بڑھتا ہُوا سیلاب اقبال کی اس نظم کے بہتے ہُوئے دھارے میں موجزن نظر آرہا ہے۔ نظم کے ہر مصرعہ میں محنت کشوں کے دھڑکتے ہُوئے دلوں اور فاقہ مستوں کی نبضوں کی جنبش ہے۔ دُنیا میں سب سے پہلے اسلام نے ملوکیّت پرستی اور سرمایہ داری کی لعنت کے خلاف آوازِ بُلند کی اور غلام و آقا، آجر و ماجُور اور امیر و غریب کا پردۂ امتیاز چاک چاک کیا۔

محنت کشوں کے حقُوق کی حفاظت کی۔ پسینے اور سونے کو ایک ترازو میں تولا اور "اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہ" کہہ کر اس طبقے کی عزّت و آبرو کو چار چاند لگا دیئے۔ "مزدُور کی مزدُوری اس کا پسینہ سوکھنے سے پہلے ادا کرو" کے ارشاد واجب الاذعان نے استحصال و استبداد کے تابُوت میں آخری کیل ٹھونک دی! لیکن اِن زرّیں ارشادات پر کہاں تک عمل ہُوا؟

سرمایہ دار مُسلمان قرآن اور حدیث کو اپنے مقاصد اقتدار کا آلۂ کار بناتا رہا اور آج تک بنا رہا ہے۔ اگر معاشرے کی بُنیاد ان اُصولوں پر رکھی جاتی تو آج مزدُور طبقہ عُریاں اور فاقہ کش نہ ہوتا! اور انسانیّت کا ایک مفید اور خادم عنصر ذلّت اور کسمپرسی کی حالت میں نہ رہنے پاتا۔ اسلام نے معاشی مساوات کے سبق آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے دیئے، جس کا چربہ آج اشتراکیّت اُڑا رہی ہے۔

اس نظم اور ایسی ہی چند نظموں مثلاً خضرِ راہ کی بناء پر بعض نقّادوں کو اقبال اشتراکیّت سے متاثر نظر آتا ہے، لیکن یہ غلط ہے۔ اقبال مزدُوروں کی حمایت انہی معنوں میں کر رہا ہے جو قرآن اور حدیث کی روشنی میں اسلام کی معاشی مُساوات کا اصل الاُصول ہیں۔ اقبال نے اور کئی مقامات پر اشتراکیّت کی محدُود مادی اقتدار پر کڑی تنقید کی ہے۔ کیوں کہ اشتراکیّت مادے سے آگے ایک قدم بھی نہیں جاتی۔ اس کے ہاں روحانی اقدار نہ ہونے کے برابر ہیں یا محض انفرادی حیثیّت رکھتی ہیں اور معاشرے میں دخیل و مؤثر نہیں۔ اس کا مدار مساواتِ

Scanned with CamScanner

شکم تک محدود ہے۔ اسی لئے تو اقبال اسے مشورہ دیتا ہے کہ ع

بگذر از لا جانب الآخرام

یعنی تُو نے لا قیصر و لا کسریٰ کہہ کر شہنشاہیت کا خاتمہ تو کر دیا اور یہ قدر تو اسلام میں بھی مشترک ہے لیکن اس نفی ماسوا اللہ کے بعد الا اللہ کہہ کر الوہیت کا اقرار بھی کر لے تاکہ ہم تم ایک ہو جائیں!

اِس لئے یہ خیال کہ اقبال نے اشتراکیت کے مبلغ کارل مارکس سے تاثر لیا ہے غلط ہے۔ کیونکہ اقبال کی سلطانیٔ جمہور میں تو "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ" کی رُوح کارفرما ہے۔

تضمین

فرمانِ خداوندیہ بندوں کو سُنا دو! عالم کو وہی رنگِ مساوات دکھا دو!
ہر سرکش و مغرور کی گردن کو جھکا دو "اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو!
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو!"

مُستحکم و مضبُوط ہوں دل رشتۂ دیں سے روشن کرو سینوں کو دمِ رُوحِ امیں سے
مِٹ جائے غلامی کا نشاں رُوئے زمیں سے "گرماؤ غلاموں کا لہُو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرمایہ کو شاہیں سے لڑا دو!"

ظُلمت گئی اب نُور کا آتا ہے زمانہ! پھر عدل کے دستُور کا آتا ہے زمانہ!
مُختاریٔ مجبُور کا آتا ہے زمانہ "سُلطانیٔ جمہُور کا آتا ہے زمانہ!
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو!"

جس کھیت سے دہقاں کی بھرتی نہیں جھولی جس کھیت سے مزدُور کو ملتی نہیں روزی
جس کھیت سے بڑھتی ہے زمیندار کی مستی "جس کھیت دہقاں کو میسّر نہیں روٹی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو!"

بندے کو خُدا دیدۂ بیدار اگر دے بے پردہ نظر آئیں اُسے حُسن کے جلوے
کیوں بندہ جُھکے بندۂ مجبُور کے آگے "کیوں خالق و مخلُوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو!"

Scanned with CamScanner

مغرب کے تمدّن سے جہاں محوِ فغاں ہے — اَب اس کی تباہی پہ زمانہ نگراں ہے
تنقید میں بھی جذبۂ تعمیر نہاں ہے — "تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے"
آدابِ جنُوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو!

"حقیقت و مجاز"

ٹوٹے ہوئے دل کی گراں مائیگی ٹوٹے ہوئے دل ہی جانتے ہیں۔ عشق کی کیف آفرینیاں علامہ اقبال کے ابتدائی کلام میں بھی اسی طرح جلوہ گر ہیں، جس طرح آخری کلام میں شروع سے آخر تک یہاں حقیقتوں کے جلوے برنگِ مجاز نظر آئیں گے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا شاعر حیاتِ مستقبل سے صرفِ نظر کر کے ماضی کے دامن میں کیوں پناہ لیتا ہے؟ اس کی نظریں تیرہ سو سال پیچھے کی طرف کیوں دوڑتی ہیں؟ کیا یہ ماضی پسندی ترقی کے رستے میں حاصل تو نہیں؟ ان سوالات کا جواب یہ ہے کہ شاعر ماضی اور حال دونوں کا مبصر ہے۔ اسے حال کی مُبتذل ناآشنائے مروّت دُنیا میں قرونِ اُولیٰ کا خلوص، للّٰہیت، ایثار اور تقویٰ نظر نہیں آتا تو ایسے شاندار حیات افروز دورِ گزشتہ پر حسرت کی نظر ڈالتا ہے اور بعینہٖ حالی کے انداز میں اس کے دل سے بھی ہُوک سی اُٹھتی ہے ع

ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تُم

اس کیفیت میں وہ ماضی و حال کا موازنہ بھی کرتا ہے ؎

تم ترستے ہو کلی کو وہ گُلستاں بکنار
تم ہو گُفتار سراپا وہ سراپا کردار!

اصل میں ماضی و حال اور قدیم و جدید کی تقسیم ہی تنگ نظری کا نتیجہ ہے۔ زندگی کی صالح اقدار جس دور میں پائی جائیں انہیں ہر زمانے میں اپنانا چاہیئے ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم!

Scanned with CamScanner

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے ۔ خَیْرُالْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ۔
"یعنی بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے ، پھر وہ لوگ جو اِس سے ملحق ، پھر وہ لوگ جو اس سے ملحق ۔"

ہمارا رُومیٔ ثانی اقبال بھٹکے ہُوئے آہوؤں کو پھر سُوئے حرم لے جانا چاہتا ہے تاکہ اس دَور کے مُسلمان بھی اسی صداقت ، اسی بے لوثی ، اسی جذبۂ خدمت ، اسی جذبۂ اخوت اور اسی حق پرستی کے رنگ میں رنگے جائیں ، جس میں اُن کے اسلاف رنگے ہُوئے تھے ۔ وہ آج بھی عشق میں وہی گرمیاں اور حُسن میں وہی شوخیاں دیکھنے کو ترستا ہے ، جس کی قرونِ اُولیٰ میں فراوانی تھی اور آج فقدان ۔

تضمین

کبھی ایسی لہر بھی موجزن مرے محیطِ نیاز میں
کہ اُلٹ کے پردۂ چار سو تجھے لاؤں خلوتِ راز میں
مری بندگی کی قسم نہ رکھ مجھے انتظارِ دراز میں
"کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں!"

تو بہارِ ناز چمن کی ہے تو چمن میں جلوہ فروش ہو
کبھی بن کے لالۂ دلکشا روشوں پہ رنگ بدوش ہو
کبھی بن کے نغمۂ جانفزا تو عدوئے محفلِ ہوش ہو
"طرب آشنائے خروش ہو تو نوائے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا جو چھُپا ہُوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں!"

ہے اگر ہجومِ بلا تو کیا ، ترا شیشہ ٹوٹ گیا تو کیا
تجھے کیا خبر کہ متاعِ دل ہے شکست ہی میں گراں بہا
کہیں اس کو ٹھیس لگے ذرا تو یہ آئینہ ہے خُدا نما
"تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں!"

نہ رہے وہ زاہدِ حق نما ، نہ رہے مجاہدِ صف شکن
نہ وہ اب مغنیٔ خوش نوا نہ وہ نغمہائے شرر فگن
نہ بلند زمزمۂ انا کہیں دار ہے نہ کہیں رسن
"دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز نہ مری حدیثِ گداز میں!"

تری رحمتوں کے طفیل ہی مجھے خُوئے جُرم یہاں ملی
تری شفقتوں کی تلاش میں مرے دل کو تاب و تواں ملی
وہیں میرا شوقِ گناہ تھا تری شانِ لُطف جہاں ملی
"نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جُرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں!"

Scanned with CamScanner

ہُوئی سرد آتشِ شوق یُوں کہ ہے زندگی پہ اجل گراں
ترے جلووں میں وہ کشش رہی نہ مری نگاہ میں تیزیاں
نہ وہ عشوہ ہائے سکُوں رہا نہ وہ نالہ ہائے شرر فشاں
"نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حُسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زُلفِ ایاز میں!"

ترا دل ہے جلوہ گہِ بُتاں ترے لب پہ ذکرِ خُدا خُدا
ذرا پُوچھ اپنے ہی دل سے تُو کہ یہی ہے سمت رہِ وفا؟
نہیں تجھ میں رنگِ خلُوص ہی تری بندگی ہے مذاق سا
"جو میں سربسجدہ ہُوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں!"

"مَن کی دُنیا"

من کی دُنیا تن کی دنیا سے کتنی مختلف ہے؟ کہاں سوز و مستی اور جذب و شوق اور کہاں سود و سودا اور مکر و فن "تن" انسان کو اسفل السافلین میں گرا دیتا ہے اور "من" عرش اعظم پر اڑاتا ہے ع

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

"مَن" سے مُراد نفسِ مطمئنہ ہے "تن" سے نفسِ امارہ۔ "من" روح کی کیفیت منزّہ و مطہر ہے۔ جبکہ یہ آلائشِ غرض اور کثافت ہیم و رجا سے پاک ہو جاتی ہے۔ "من" استغنا و اطمینان کا مرکز اور "تن" جذباتِ سفلی کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ "من" مصدرِ خیر ہے اور "تن" منبعِ شر۔

عُلمائے اخلاق نے نفسِ انسانی کے تین مدارج قرار دیئے ہیں۔ نفسِ امارہ، نفسِ لوّامہ اور نفسِ مطمئنہ۔ پہلا مقام وہ ہے جس میں انسانی روح نفسانی خواہشات کی تابع ہوتی ہے طبیعت کے تقاضوں کی تکمیل ہی اس کا مقصد اور نصب العین ہوتا ہے۔ یہ مقام اِنَّ النَّفسَ الاَمَّارۃ بالسُّوءِ کا مقام ہے۔ دُوسرا مقام نفسِ لوّامہ کا ہے۔ جبکہ انسانی رُوح اپنے اعمال کا محاسبہ کرتی ہے اور جائزہ لیتی ہے۔ اپنی لغزشوں اور خطا کاریوں پر اپنے آپ کو ملامت کرتی ہے، یہ مقام پہلے مقام سے بہتر ہے۔ جبکہ ندامت و ملامت کے بعد انابت اور رُجوع الی اللہ کا دروازہ کھُل جاتا ہے، مگر یہ عین کمال نہیں۔ تیسرا مقام نفسِ مطمئنہ کا ہے۔ جس میں انسانی رُوح تمام خواہشاتِ سفلی اور گناہ کے تقاضوں پر غالب آجاتی ہے اور عارضی سُود و زیاں سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ اسی کی بدولت انسان خُودداری و استغنا کی اس دُنیا میں پہنچ جاتا ہے، جہاں کوئی طاغوتی طاقت اسے سرنگوں نہیں کر سکتی، جہاں پہنچ کر انسان صداقت و خلُوص کا پیکر بن جاتا ہے اور کذب و ریا کی پرچھائیاں تک اس پر نہیں پڑ سکتیں۔

اقبال نے "مَن اور تن" کے اس موازنے میں انسان کو دیانت کا اعلیٰ کردار اپنانے کی تلقین کی ہے۔ اس نے "تن" کے آذر کدے میں ابراہیمی تیشہ اٹھایا ہے اور سُود و سودا، مکر و فن کے بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا ہے اور

Scanned with CamScanner

اس میں "من" کی تقدیس از سرِ نو قائم کی ہے ——— نظم کی سادگی و پُرکاری اس کی معنویت پر مستزاد ہے بعض مصرعے سہل ممتنع کی زندہ مثال ہیں۔ سیدھی سادی باتوں میں حقائق و معارف کا سمندر موجزن ہے۔

تضمین

ہے خودی کے نُور سے روشن چراغِ زندگی — اس کے دم سے پھُولتا پھلتا ہے باغ زندگی
تُو بھی اس میخانے سے پی لے ایاغ زندگی — "اپنے من میں ڈُوب کر پا جا سراغِ زندگی
تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن!"

من کی دُنیا ماورائے شرق و غرب و بخت و فوق — من کی دُنیا میں نظر آئے نہ محکُومی کے طوق
من کی دُنیا لذتِ ایثار و قربانی کا ذوق — "من کی دُنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دُنیا؟ تن کی دُنیا سُود و سودا مکر و فن!"

من کی دولت، دولتِ دُنیا سے شرماتی نہیں — من کی دولت ہو تو دل کو حرص تڑپاتی نہیں!
من کی دولت بے سکُونِ قلب ہاتھ آتی نہیں — "من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں!
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن!"

من کی دُنیا میں نہیں ملتا نشانِ احتیاج — من کی دُنیا میں نہ دیکھی بے نیازِ تخت و تاج!
من کی دُنیا دے نہیں سکتی حکُومت کو خراج — "من کی دُنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دُنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن!"

ہے غنیمت عارفوں کو شاعرِ مشرق کی ذات — جس کی باتوں میں چُھپے ہیں علم و حکمت کے نکات
سچ تو یہ ہے بندۂ محکُوم ہے ننگِ حیات — "پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تُو جُھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من!"

Scanned with CamScanner

"کشفُ الغِطا"

جب حجاباتِ غفلت اُٹھ جاتے ہیں تو تقدیرِ اُمم آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے ۔شمشیر وسناں کیا ہیں ؟ قوموں کا عنفوانِ شباب عروج و اقتدار اور تغلّب و تسلّط اور طاؤس و رُباب کیا ہیں ؟ قوموں کا ضعف و انحطاط، زوال و اضمحلال اور محکومی کا پیش خیمہ !

اقبال نے شمشیر وسناں اوّل اور طاؤس و رُباب آخر کہہ کر اقوامِ عالم کے فلسفۂ عُروج و زوال کا خلاصہ پیش کر دیا ہے اور یہ حقیقت تاریخِ عالم کا نچوڑ ہے کہ جب بھی قومیں اُبھرتی ہیں اپنے عزم و اقدام اور صولت و اقتحام کے بل بوتے پر، اس دور میں خالد و طارق ، مُوسیٰ بن نصیر اور محمّد بن قاسم پیدا ہوتے ہیں ۔فتوحات کے پھریرے اقتضائے عالم تک اُڑتے ہیں اور شوکت و جلال کے ڈنکے چار دانگ عالم میں بجتے ہیں ۔ دشت و دریا اس کے جانبازوں کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں اور بحرِ ظلمات تک اس کے گھوڑوں کی جولانگاہ بن جاتا ہے ۔کسی قوم کی ابتداء اسی جذبۂ سرفروشی سے ہوتی ہے لیکن جب اسی قوم میں صفاتِ جُرأت و جلادت کا فقدان ہونے لگتا ہے تو یہی قوم تاناشاہوں ، محمّد شاہ رنگیلوں اور واجد علی شاہوں کو جنم دیتی ہے ۔شمشیر وسناں کی جگہ طاؤس و رُباب، تیر و تفنگ کی جگہ شیشہ و ساغر اور طبل و علم کی جگہ گھنگرو اور لشواز لے لیتے ہیں ۔

قوموں کی زندگی میں یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے ، جب کوئی دُوسری قوم جو مردانہ صفات سے متصف ہوتی ہیں۔ اس پست ہمّت قوم کو اپنی غلامی اور محکُومی کی "پناہ" میں لے لیتی ہے اور شکست خوردہ قوم اسے ظلِّ الٰہی سمجھنے لگتی ہے ۔کچھ عرصہ یہ قوم بھی اپنی فاتحانہ صلاحیتوں کی بدولت زندہ رہتی ہے ، لیکن جب اس میں بھی عیش و عشرت کے رجحانات نمُودار ہونے لگتے ہیں تو کوئی اور زبردست قوم اُسے بھی آغوشِ فنا میں سُلا دیتی ہے ۔یہی خُدا کی سُنّتِ جاریہ ہے اور یہی تاابد رہے گی ۔یہ حقیقت ایک مستقل حقیقت ہے ۔

اِس موقع پر ہمیں وہ دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے جب مُحمّد شاہ رنگیلے نے ایک محفل میں نادر شاہ کے موٹے

Scanned with CamScanner

جھوٹے لباس پر طنز کیا اور کہا کہ یہ بادشاہوں کے شایانِ شان ہے؟ نادر شاہ نے برجستہ جواب دیا کہ "یہی وہ لباس ہے جو مجھے ایران سے ہندوستان لایا اور جس نے مجھے اتنے بڑے ملک کا فاتح بنایا" اور تیرے جسم پر جو ڈھاکے کی ہلکی پھلکی ململ ہے اُس نے تجھے محل سے بھی نکلنے نہیں دیا ——— کتنا وزن ہے نادر شاہ کی بات میں! یہ "طاؤسیئے اور ربابیئے" نازنین قسم کے بادشاہ ہی تو قوموں کے تابوت میں آخری کیل ہوتے ہیں!

کاش ہماری قوم کے طاؤس پرست اور ساغر مست اُمراء بھی اقبال کے اِس پیغام سے عبرت حاصل کرتے تاکہ یہاں بھی شمشیر و سناں کا دور شروع ہو سکے!

تضمین

آتا ہے اُمیدوں پر ہنگامِ شباب آخر — ہوتا ہے دُعاؤں سے رحمت کا خطاب آخر
ایوانِ اجابت کے کھُل جاتے ہیں باب آخر — "افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب اوّل اُٹھتے ہیں حجاب آخر!"

آگاہ خُودی اب تک گورے ہیں نہ کالے ہیں — پھندے یہ غُلامی کے تقدیر نے ڈالے ہیں
مشرق کے مکیں اب بھی مغرب کے نوالے ہیں — "میخانۂ یورپ کے دستُور نرالے ہیں
لاتے ہیں سُرُور اوّل دیتے ہیں شراب آخر!"

دیکھی ہے کبھی تُو نے تصویرِ اُمم کیا ہے — معلُوم ہے سامانِ توقیرِ اُمم کیا ہے
تخریبِ اُمم کیا ہے تعمیرِ اُمم کیا ہے — "میں تجھ کو بتاتا ہُوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر!"

ہر مرحلہ اُلفت کا پُر کیف و سُرُور افزا — ہر گام پہ اک اُلجھن ہر طُور پہ اک مُوسیٰ
آغاز لطیف اس کا، انجام لطیف اس کا — "احوالِ محبّت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سوز و تب و تاب اوّل سوز و تب و تاب آخر!"

کیا رفعتِ مُختاری کیا نکبتِ مجبُوری! — کیا سطوتِ چنگیزی کیا دولتِ فغفُوری
کرتی ہے خراب آخر سرداری و محمُوری — "کیا دبدبۂ نادر کیا شوکتِ تیمُوری!
ہو جاتے ہیں سب دفتر غرقِ مئے ناب آخر!"

Scanned with CamScanner

بیتاب ہیں پھر جلوے پردوں میں کمی آئی — بیباک اداؤں کو پھر عشوہ گری آئی
پھر دیکھنے والوں میں شوریدہ سری آئی — "خلوت کی گھڑی گزری جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے دامانِ سحاب آخر!"

عالم ہے طبیعت پر دریا کی روانی کا — طوفاں ہے مرے لب پر اب نغمۂ بیانی کا
رُکنا کوئی آساں ہے بہتے ہوئے پانی کا؟ — "تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر!"

Scanned with CamScanner

"تُو کِہ مَیں"

اِنسان کیا ہے ؟ ـــــ مقصدِ کون و مکاں ، خلاصۂ کائنات ، افسانۂ عالم کا شوخ عنوان ، طُوفانِ زندگی کی چلتی ہُوئی لہر ، آفتابِ ہستی کی مُسکراتی ہُوئی کِرن ، آتشِ وجُود کی سُلگتی ہُوئی چنگاری اور مصوّرِ فطرت کا ایک حسین و نادر شاہکار ۔

عالم کیا ہے ؟ ـــــ ممکناتِ اِنسان کی جولانگاہ ، شہسوارِ زندگی کا میدانِ عمل اور رہ نوردِ عبُودیّت کی گردِ راہ ۔

اقبال کی یہ نظم عالم کی بے بصری اور اِنسان کی خود نگری کی آئینہ دار ہے "وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ" کی ترجمان اور "سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ" کی تفسیر ۔

اہلِ مذاہب کا یہ نظریہ کہ اِنسان اشرف المخلوقات ہے ۔ علماءِ طبیعیات کے نتائجِ فکر کے بھی نقیض نہیں ۔ زندگی جمادات ، نباتات اور حیوانات کے سہ گانہ مراحلِ ارتقاء طے کرتی ہُوئی تخلیق کے مظہرِ اتم تک پہنچی ہے ۔ قدرت کے اِس محبُوب نقطۂ تکمیل کے لئے ارض و سما نے نجانے کتنے چکر کاٹے ، آب و خاک و باد و آتش نے نجانے کتنی کروٹیں لیں اور مہر و ماہ کی شعاعیں نجانے کتنے قالبوں میں ڈھلیں کہ یہ نادرۂ روزگار ، یہ خلاصۂ موجُودات ، یہ لطیفۂ غیبی یعنی اِنسان عدم سے منصّۂ شہُود پر جلوہ گر ہو سکا ۔ اقبال عالمِ اِنسانیّت کا شاعر ، اس کی عظمتیں بیان کرتے کبھی نہیں تھکتا ۔ وہ بار بار بُلند آہنگی سے اِنسان کی اہمیّت ، قدرت و شوکت کے گیت گاتا ہے وہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا کی لَے کے ساتھ لَے ملاتا ہے اور کہتا ہے ؎

فروغِ خاکیاں از ثوریاں افزوں شود روزے
زمیں از گردشِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے

Scanned with CamScanner

یہ نظم بھی اسی وجدآفرین اور سرورآفرین نغمے کی ایک لَے ہے۔

تضمین

عالمِ رنگ و بُو ہے تارِ نہاں ہے تُو کہ میں ؟
نقش گرِ وجُود کا نام و نشاں ہے تُو کہ میں ؟
شانِ زمیں ہے تُو کہ میں جانِ زماں ہے تُو کہ میں ؟
" عالمِ آب و خاک و باد! سرِّ عیاں ہے تُو کہ میں ؟
وہ جو نظر سے ہے نہاں اُس کا جہاں ہے تُو کہ میں ؟"

کِس کے دمِ فراغ سے بزمِ جہاں کی خُرمی ؟
داغِ جگر سے کِس کے ہے شامِ الم میں تازگی ؟
تیرگیٔ حیات میں کِس کی نظر سے روشنی
" وہ شبِ درد و سوز و غم کہتے ہیں جس کو زندگی
اُس کی سحر ہے تُو کہ میں اُس کی اذاں ہے تُو کہ میں ؟

کِس کے سجُود کے لئے شمس و قمر ہیں گرمِ سیر
کِس کے شہُود کے لئے بحر ہیں بَر ہیں گرمِ سیر
قاصدِ روز و ماہ و سال وقفِ سفر ہیں گرمِ سیر
کِس کی نمُود کے لئے شام و سحر ہیں گرمِ سیر
شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تُو کہ میں ؟"

پردہ کشائی نظر چہرہ نمائی ہُنر
میرے ہی سوز و ساز سے انجمنِ دل و نظر
نقشِ پذیرِ زندگی مجھ سے ہے خاکِ رہ گزر
" تُو کفِ خاک و بے بصر میں کفِ خاک و خُود نگر
کشتِ وجُود کے لئے آبِ رواں ہے تُو کہ میں ؟"

Scanned with CamScanner

"فریبِ نظر"

ستاروں کے بعد ماہتاب اور ماہتاب کے بعد جب آفتاب بھی غروب ہوگیا تو فریبِ نظر جاتا رہا۔ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ کی منزل سے گزر کر اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّاَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ کے مقام پر فائز ہوگئے۔

فریبِ نظر کیا تھا؛ سنگِ میل! لیکن اس بھٹکتے پھرنے میں بھی ایک لذت، اس مقامِ جستجو میں بھی ایک سرور اور تلاش حقیقت کے اس مرحلہ راہ گم کردگی میں بھی ایک نشاط آگیں کیفیت ہوتی ہے۔ یہ منزل آنی سہی یہ مرحلہ فانی سہی مگر اس کا بیان بھی داستانِ محبت کا ایک دلکش باب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان نے تلاشِ حقیقت میں صدیوں اور قرنوں ٹھوکریں کھائی ہیں اور مدتوں تشکیک و گمان کی وادیوں میں آوارہ و سرگرداں رہا ہے۔ تب کہیں ایمان و یقین کی منزل پر رسائی ہوئی ہے۔ سالہا سال تک وہم و خیال کی ظلمتوں میں ٹامک ٹوئیے مارتا رہا، تب کہیں عرفان و اطمینان کا چہرۂ روشن دیکھنا نصیب ہوا۔

اِس نظم میں شاعرِ عالمِ انسانیت کے اُن مرحلوں کا ذکر کرتا ہے جو تلاشِ حق میں اُسے پیش آئے، منزل پر پہنچ کر مرحلوں کا جائزہ لینا بڑے مزے کی چیز ہے۔ حقیقتوں پر فائز ہو کر وہم و گمان کی بھول بھلیوں پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالنا بھی سکون آمیز و روح پرور ہوتا ہے اور یہ طمانیتِ قلب نہ صرف ذاتی معاملہ ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک تاریخی تجزیہ ہے جو اجتماعی لحاظ سے بھی سرمایۂ بصیرت ہے۔

تضمین

سنگِ رہ تھا جس کو منزل کا نشاں سمجھا تھا میں — راہِ بے پایانِ ہستی کو مکاں سمجھا تھا میں
کس قدر محدود اپنا آشیاں سمجھا تھا میں — "اپنی جولانگاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں

Scanned with CamScanner

آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں!"

آسماں کیا تھا فقط مجبورِ آہوں کا طِلسم — توڑ ڈالا شوق نے پُر پیچ راہوں کا طِلسم
ہو گیا جلووں سے روشن جلوہ گاہوں کا طِلسم — "کم نگاہی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طِلسم

اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں!"

عاجزی کی رو میں ہر کوہ و بیاباں بہہ گیا — عظمتِ آدم کا قصّہ خامشی سے کہہ گیا!
میرا دل تھا جو ترا بارِ امانت سہہ گیا — "کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا

مہر و ماہ و کہکشاں کو ہم عناں سمجھا تھا میں!"

جوشِ بے تابی سے روشن ہو گئی سیمائے شوق — کاروانِ ضبط بھی ہے دیکھ رہ پیمائے شوق
راز دارِ عشق آخر ہو گیا رُسوائے شوق — "کہہ گئیں رازِ محبّت پردہ داری ہائے شوق

تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں!"

راہِ اُلفت راہ ہے جس میں نہیں کوئی مقام — رُوشناسِ زندگی کو لامکاں ہے چند گام
زندگی کیا ہے فقط ذوقِ سفر ہے والسّلام — "عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قِصّہ تمام

اِس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں!"

ہم تو پیچھے رہ گئے آگے گئے مردانِ چاک — آہ اَب دشتِ جنُوں میں دم بدم اُڑتی ہے خاک
قافلے کے کوچ سے درماندہ سینۂ چاک — "تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک

جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں!"

Scanned with CamScanner

"ستاروں سے آگے"

یہ غزل انسان کے غیر محدود امکانات کا جائزہ ہے ۔ جذبۂ ارتقاء کی لہریں اس کے ہر مصرع پر اہتزاز آفریں ہیں اور سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی ایک دلآویز تفسیر ہے ۔

ابتدائی حالات میں انسان اس کرۂ ارض پر مجبورِ محض تھا ۔ اس نے صدیوں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر فطرت کی بے رحم طاقتوں کا پامردی سے مقابلہ کیا اور بتدریج اس چیز کو اختیار کے سانچے میں ڈھالا ہے ۔ آب و خاک و باد و آتش سے استخدام اسی کا لازمی ثمرہ ہے ۔ آب و ہوا کے جھونکے اس کے فراش اور بجلی کی لہریں اس کے ادنیٰ بادکش ہیں اور مظاہرِ قدرت پر اس کی فوقیت کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا ۔ اقبال کا تخیل فطرت کے اس شاہکار یعنی انسان کو ستاروں پر کمند ڈالنے اور مہر و ماہ کو بھی نخچیر بناتے دیکھ رہا ہے ۔ اشرف المخلوقات کی سطوت و جبروت کی کوئی حد نہیں اور اس کی سعیِ پیہم اور جذبۂ محکم سے بعید نہیں کہ اس خرمِ خاکی سے نکل کر دوسرے سیاروں کو بھی اپنی جولانگاہ بنالے !

انسان کی بے پناہ قدرت و شوکت کچھ دماغوں کو ممکن ہے بے ہریت کی طرف لے جائے ، جہاں انہیں انا دالغیری کا زعمِ باطل پیدا ہو جائے ۔ لیکن اہلِ نظر کے نزدیک یہ عظمتِ آدم بھی عطیہ ربانی اور انعامِ الٰہی ہے ۔ انسان کے شاندار مستقبل میں بھی انھیں صفاتِ الٰہیہ ہی کی جلالی شان جلوہ گر نظر آتی ہے ۔ یہ اقتدار و اختیار انسان کی فطرت میں اسی نے ودیعت کیا اور اس کی قوت سے فعل میں لانا انسانی تخلیق کا منشأ پورا کرنا ہے ۔ وَلِذَالِکَ خَلَقَکُمْ اسی طرف اشارہ ہے اور عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ کی یہی غایت ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کی بدولت عناصر پر حاکم ہو جائے ۔

اقبال نے ہر نظم میں مستقبل کے اس کامل اور برتر انسان کی آمد کی پیشینگوئی کی ہے جس کا وہ ع

اے سوار اشہبِ دوراں بیا

Scanned with CamScanner

کہہ کر استقبال کرتا ہے۔

اقبال کو اَب اس امر کا بھی اطمینان حاصل ہو گیا ہے کہ اُس نے اپنے ہمخیالوں کا ایک حلقہ پیدا کر لیا ہے۔ جو اِس کے امیال و عواطف کو ٹھیک ٹھیک سمجھتے ہیں، ورنہ اس سے پہلے تو تحسین ناشناس کرنے والے نظر آتے تھے جو اسے ایک غزل خواں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اِس مرحلے پر اسے تنہائی کا شکوہ نہیں رہا۔ کیوں کہ اب اسے رازداں یا صحیح معنوں میں سخن فہم مل گئے ہیں۔ بحمداللہ کا پیغامِ عالمگیر دلوں کی گہرائیوں تک اُترنے لگا اور اسے اپنی محنت کا ثمرہ زندگی ہی میں مِل گیا۔

ایک عظیم شاعر و فنکار کا مقصد کسبِ زر یا کسبِ شُہرت نہیں ہوتا بلکہ فقط یہ کہ اس کے مخلصانہ خیالات دُوسرے قلوب تک بھی پہنچ جائیں جو اُن کے دل و دماغ کو گرماتے رہے ہیں۔ اِس نقطۂ نظر سے بھی اقبال ایک کامیاب ترین فنکار ہے۔

تضمین

ابھی سر پہ بارِ گراں اور بھی ہیں — مُحبّت کے سرِّ نہاں اور بھی ہیں
بساطِ زمیں پر زماں اور بھی ہیں — "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!"

یہی کہہ رہی ہیں نشیلی گھٹائیں — چلیں گی یہاں رُوح پرور ہوائیں
زمیں کی تہی دامنی پر نہ جائیں — "تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں!"

نگاہیں جماشانِ فیضِ نمو پر — مُرادیں ہیں عاشق تری آرزُو پر
یہ سب منحصر ہے تری جُستجو پر — "قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں!"

مُرادوں سے خالی ہے دامن تو کیا غم! — ہُوا دل اُمیدوں کا مدفن تو کیا غم!
خزاں سے ہے پامال گلشن تو کیا غم! — "اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم!
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں!"

Scanned with CamScanner

فرشتوں کے لب پر ہے پیغام تیرا — زمانے میں چمکے گا اب نام تیرا!
ستاروں سے روشن ہے انجام تیرا — "تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا!
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں!"

ملی ہے تجھے حق سے گر چشمِ بینا! — تو مشکل نہیں زندگی کا معمّا!
زمانے کی گردش سے بچ کر نکل آ — "اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا!
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں!"

بہت ہم صفیر آج ہیں اس چمن میں — بہت ہمنوا مل گئے ہیں وطن میں!
صدا جن کے دل کی ہے میرے سخن میں — "گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں!
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں!"

Scanned with CamScanner

"محبّت"

مُحبّت کا موضُوع عالمگیر موضُوع ہے ۔ انبیاء ، اولیاء ، فلاسفر و شعراء نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے مُحبّت کی شرح و تفسیر کی ہے ۔ عُلمائے طبیعیات کے نزدیک مُحبّت ایک کشش ہے ، جو اجرامِ فلکی کی تشکیل و گردش کا باعث ہے ۔ انبیائے کرام و اولیائے عِظام اسے خالق و مخلُوق کے رشتۂ عبد و معبُود سے منسُوب کرتے ہیں ۔ اخلاقیّین سے بنی نوع انسان کے جذبۂ اخوّت کا آئینہ دار قرار دیتے ہیں اور شعراء اسے اصل حیات و باعثِ تکوینِ کائنات سمجھتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ مُحبّت رُوحِ کائنات ہے ۔ یہ کہیں سینۂ سنگ سے چنگاریاں بن کر نکلتی ہے ۔ کہیں لالہ و گُل میں رنگ و بُو کا طُوفان بن کر پھُوٹتی ہے ۔ آہن و مقناطیس ، کاہ و کہربا ، ماہ کتاں کا ربط باہم مُحبّت ہی کا کرشمہ اور چاند اور چکور کا جذبِ پیہم مُحبّت ہی کا شعبدہ ہے ۔ گُل و بُلبل کے راز و نیاز اس کا ادنیٰ کھیل اور شمع و پروانہ کا سوز و گداز اس کا معمُولی مشغلہ ہے ۔ کوئل کے من کی کوک اور ابنِ آدم کے دل کی ہُوک اسی کے مسلسل مظاہر ہیں ۔

لیکن اقبال نے مُحبّت کو بھی نئے معنی پہنائے ہیں ۔ اُس کے نیاز میں بھی ایک ناز ۔ اُس کی افتادمیں بھی ایک غرُور اور اس کے عجز میں بھی ایک وقار ہے ۔ اقبال کی مُحبّت بھی اقبال کی طرح خُود بین و خود دار ہے ، وہ گرنا نہیں اُبھرنا سکھاتی ہے ۔ یہاں سرنگونی کی بجائے سرفرازی ہے اور سربریدی کی جگہ سربلندی ہے ۔ اس کی مُحبّت بیانگِ دہل انسان کی خُود داری اور عزّتِ نفس کا پیغام دیتی ہے ۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ع

حُسن ہے مستِ ناز اگر تو بھی جوابِ ناز دے !

مُحبّت کا یہی تصوّر اقبال کو دُوسرے شعراء سے ممتاز کر دیتا ہے ۔ اس کے ہاں عشق ایک بُلند مقام پر

Scanned with CamScanner

فائز ہے ۔جس سے نیچے اُترنا اس کے غلوِ مرتبت کی توہین ہے ۔ اُسے نیاز مندی میں بھی اپنی خُودی کا خُون گوارا نہیں، عشق باعثِ عزّت و افتخار ہے نہ کہ موجبِ ذلّت وانکسار !

عشق و مُحبّت اقبال کے نزدیک دین کی اعلیٰ اقدار سے عبارت ہیں اور عقل، مادیّت کے قیاس وظن وتخمین! عشق چراغِ مُصطفویؐ ہے اور عمر و شرارِ بُولہبی ، دین اسد اللّٰہی ہے اور بے دینی ، مرحبیؓ و عنتری ! مقصدِ مُصطفویؐ ہدایت ہے اور منشائے بولہبی ضلالت ۔ مُحبّت شیرازۂ حیات مجتمع رکھتی اور ارتقائے زندگی کی ضامن ہے ، اس لئے مجسمۂ خیر اور موجبِ برکت ہے ۔نفرت نظامِ کائنات میں انتشار پیدا کرتی ہے اور انسان کو اسفل السافلین میں گرا دیتی ہے ۔ اس لئے یہ مادۂ شر ہے اور اصل فساد!

اقبال نے اپنی عالمگیر تعلیمات میں مُحبّت کے پُرجوش گیت گائے ہیں ۔ اُن میں سے ایک یہ بھی ہے جس کی تضمین پیش کی جاتی ہے ۔آپ نے محبّت کے نیاز بہت دیکھے ہیں ، مُحبّت کی بے نیازیاں بھی دیکھنے کی چیز ہیں ۔

تضمین

جہاں سے نرالی مری عشق بازی — زمانے میں یکتا مری سرفرازی
یہیں سرفروشی یہیں جانگدازی — "شہیدِ مُحبّت یہ کافر نہ غازی
مُحبّت کی رسمیں نہ تُرکی نہ تازی "!

مُحبّت کی طینت میں ذلّت نہیں ہے — مُحبّت کبھی پستیِ فطرت نہیں ہے
غُلامی کی خوگر طبیعت نہیں ہے — "وہ کچھ اور شے ہے مُحبّت نہیں ہے
سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی "!

مُحبّت اگر جلوہ آرا نہیں ہے — تو میری نگاہوں میں دُنیا نہیں ہے
مُحبّت اگر ہے تو پھر کیا نہیں ہے — "یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے
تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی "!

مُحبّت سے ہے خُود نگر نوعِ انساں — سلاطیں ہیں شانِ مُحبّت پہ حیراں
قیودِ دو عالم سے ہیں یہ گریزاں — "نہ محتاج سُلطاں نہ مرعُوبِ سُلطاں
مُحبّت ہے آزادی و بے نیازی "!

Scanned with CamScanner

حقائق عیاں ہیں مری شاعری سے نکات آشکارا سخن گستری سے
مری قدر پوچھو کسی جوہری سے "مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی"!

Scanned with CamScanner

مقامِ بندگی

میں انساں ہُوں مجھ کو فرشتہ نہ کہنا
یہ توہین ہے قدردانی نہیں ہے (آغا صادق)

اقبال اس سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھ جاتے ہیں اور شانِ خداوندی بھی لینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اللہ رے مقامِ بندگی کی قدر و قیمت! لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ "مقامِ بندگی" کیا ہے، جسے دے کر اقبال شانِ خداوندی بھی لینے پر رضامند نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ "مقامِ بندگی" سے مراد کائنات میں انسان کی قدر و قیمت مبداء و معاد میں قدرت کے اس شاہکار کی اہمیت اور اس کے وظیفۂ حیات کا تعین ہے۔ اسلام کی رُو سے انسانی زندگی کے دو اہم پہلو ہیں۔ ایک ہے اطاعتِ الٰہی اور دُوسرا تسخیرِ فطرت! خالقِ کائنات نے تمام موجودات کو انسان کے استخدام کے لئے پیدا کیا ہے اور انسان کو اپنی عبادت کے لئے، لیکن عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ عبادت رسمی نماز، روزہ، حج تک محدود نہیں۔ یہ وظائف تو مستقلاً تذکرہ و تدبر کی رُوح پیدا کرنے کے ذرائع ہیں مقاصد نہیں۔ جیسا کہ کلامِ پاک میں آیا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ۙ

حقیقت یہ ہے کہ بندگیٔ کائنات میں اپنے مقام کا صحیح عرفان ہے کہ بندے کو دُوسری مخلوقات سے کیا نسبت ہے اور خالقِ موجودات سے کیا تعلق۔ عبُودیّت کی مظہر یہ نصِ صریح ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ اور تسخیرِ فطرت کی موید ہے۔ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝

یہاں تک "ہُوا مبداء" کا ذکر تھا۔ اب رہا معاد تو انسانی معاد کے متعلق بخلافِ عقیدہ متصوفین اقبال کا خیال ہے کہ انسانی رُوح ذاتِ الوہیت میں مدغم نہیں ہو جاتی بلکہ اپنی جداگانہ ہستی برقرار رکھتی ہے۔ ذرہ آفتاب میں گم نہیں ہو جاتا بلکہ آفتاب کے حضور جداگانہ کر اکتسابِ نور کرتا رہتا ہے اور آفتاب کے خصائصِ نور و حرارت اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ عبُودیت معاد میں بھی عبُودیت ہی رہے گی۔

Scanned with CamScanner

الوہیت میں شامل ہو کر اپنی انفرادیت ضائع نہیں کر دے گی ۔ اقبال فنائے ذات کا قائل نہیں ، نہ مبداء میں نہ معاد میں ۔ اِسی لئے اُسے مقامِ بندگی اتنا عزیز ہے کہ وہ اس کے بدلے شانِ خداوندی لینا خسارے کا سودا سمجھتا ہے ۔

اقبال ایک جگہ اور " مقامِ بندگی " کی نشاط آفرینی و لذت اندوزی کا ذکر مزے لے لے کر کرتا ہے ۔

خُدائی اہتمامِ خشک و تر ہے
خُداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ
یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

اقبال نے اس غزل کے ایک شعر میں فلسفۂ تعلیم کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ کیا ہے ۔ اقبال علم و ادب و تربیت کو " خبر " سے زیادہ " نظر " اور رسمی درس و تدریس سے بڑھ کر فیضانِ صحبت کا مرہونِ منت سمجھتا ہے اور یہاں وہ اکبر الہ آبادی کا ہم آہنگ و ہم آواز ہے ۔ جس نے اپنے مخصوص رنگ میں کہا ہے ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
علم ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

یعنی ابراہیمی نظر کے زیرِ سایہ اسماعیلی آداب پروان چڑھتے ہیں اور مادی علوم بھی الہامی سرچشموں سے پیئے بغیر تشنہ ہی رہے ہیں ۔

اقبال کو عام مقامِ انسانیت کے شعور کے ساتھ ساتھ اپنے خاص بلند مقام کا بھی احساس ہے جو اُسے بحیثیت مبصرِ حیات حاصل ہے ۔ اس نے عالمِ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا جو پیغام دیا ہے ، اس کی اثر آفرینی اور نفوذ و رسوخ کا بھی اُسے پختہ یقین ہے اور آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ واقعی اس کی لحد زیارت گاہ اہلِ عزم و ہمت بن گئی ہے اور عراق و عرب کے شاہانِ عالی وقار اُسے پھولوں اور آنسوؤں کا ہدیۂ عقیدت پیش کرنا اپنا سرمایۂ عزّ و افتخار سمجھتے ہیں ۔ قلندر کا دبدبہ کجکلاہوں سے بھی خراجِ نیاز برابر وصول کر رہا ہے ۔

تضمین

نشاط انگیز ہے بزمِ عبودیت کی خورسندی — بہار اندوز ہے نخلِ خلافت کی برومندی

Scanned with CamScanner

ہزار آزادیوں سے دل کُشا اُلفت کی پابندی ! "متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لُوں شانِ خُداوندی"

جفا کو شانِ اُلفت کو قرار آتا تو کیا آتا سکوں نا آشنا رہنا ازل سے ان کا ہے شیوہ
نہ دُنیا سے انہیں مطلب نہ عقبیٰ سے انہیں جھگڑا "ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دُنیا نہ وہ دُنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی"

ابھی محشر نہ برپا کر پریشاں کر نہ خلوت کو ! چھُپی رہنے دے محمل میں ابھی لیلائے رحمت کو
ابھی کیوں آزماتا ہے مری تابِ بصارت کو "حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبّت کو
مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی"

جہانِ چار سُو اک رہگزر ہے چشمِ حیراں میں ! ہوس کیوں کر سما سکتی ہے قلبِ اہلِ ایماں میں
نہیں ہے اس کو حُبِّ خانماں عمرِ گریزاں میں "گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذِلّت ہے کارآشیاں بندی"

اَدب آموز و عقل آمیز کس کی چشمِ شفقت تھی رسالت کے لئے اُستاد آغوشِ رسالت تھی !
ازل سے انکی قسمت میں سعادت ہی سعادت تھی "یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی"

طرب گاہِ جنُوں و شوق و الفت ہے لحد میری سراپا نقش اکسیرِ محبّت ہے لحد میری
نشانِ ارتقا و شانِ عظمت ہے لحد میری "زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمّت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی"

تصنّع سے نہیں ہے کوئی نسبت حُسنِ معنیٰ کو تکلّف کی نہیں ہے کوئی حاجت حُسنِ معنیٰ کو
فقط ہے احتیاجِ حُسنِ فطرت حُسنِ معنیٰ کو "مری مشاطگی کی کیا ضرورت حُسنِ معنیٰ کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی"

Scanned with CamScanner

"سفر"

سفر ہے سوزِ زندگی سفر ہے سازِ زندگی
سفر کی پوچھتا ہے کیا سفر ہے رازِ زندگی!
جہاں کی ابتداء، سفر جہاں کی انتہا سفر
سفر نہ ہو تو بے مزا ہے یہ جہانِ تسور و تسر

راہرو کو مرحلوں کی دلچسپیاں منزلِ مقصود سے غافل نہیں کر سکتیں - آتشِ قدم رہرو ان پر طائرانہ نظر ڈالتا ہوا گزر جاتا ہے ؎

تری حدِ نظر دُنیائے آب و گِل نہ بن جائے!
یہ راہِ منزلِ مقصود ہی منزل نہ بن جائے!

اقبال کا نظریہ سفرِ زندگی مادی یا حیاتیاتی نہیں بلکہ نظریاتی یا عمرانی ہے - ایک زمانہ تھا جب انسان اپنے خاندانی مفاد سے آگے کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا - پھر شعور کچھ پختہ ہوا تو اس نے عائلی وحدت سے آگے بڑھ کر قبائلی وحدت کی طرف قدم اُٹھایا - پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہوا انسانی معاشرہ قوم و وطن کی وحدت تک پہنچا - آج کل کی مہذب اور ترقی یافتہ دُنیا میں بھی اکثر سیاسی نظریات اسی وحدت پر آکر رُک گئے ہیں - لیکن اقبال عالمِ انسانیت کی وحدت کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو اسلام کا مطمعِ نظر ہے - یہ وہ عالمگیر انسانی برادری کی وحدت ہے جس کی قدرِ مشترک عقیدۂ توحید ہے جو جغرافیائی، وطنی، لسانی اور نسلی حدُود سے ماورا ہے -

یہ غزل اِسی جذبے کی ترجمان ہے -

Scanned with CamScanner

تضمین

بندِ وطن ہے ایک دامِ رشتۂ دام سے گزر!
کہنہ ہے مغربی نظام کہنہ نظام سے گزر!
وحدتِ نسل و رنگ کے جذبۂ خام سے گزر!
"تو ابھی رہگزر میں ہے قیدِ مقام سے گزر!
مصر و حجاز سے گزر فارس و شام سے گزر"!

شانِ خلوص کچھ اور ہے، رنگِ ریا کچھ اور ہے!
طاعتِ خود نما ہے اور صدق و صفا کچھ اور ہے!
نفس کی پیروی ہے اور، راہِ خدا کچھ اور ہے!
"جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے!
حور و خیام سے گزر بادہ و جام سے گزر"!

ہوشِ ربا اگرچہ ہے جلوۂ برق بے قرار!
چہروں کا جانفزا نکھار آنکھوں کا دلنشیں خمار!
دل پہ ہے ڈالتا کمند حلقۂ زلفِ تابدار!
"گرچہ ہے دل کشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار!
طائرکِ بلند بال دانہ و دام سے گزر"!

حملۂ حیدری دکھا گونج اٹھے فضائے حرب!
مرحبیوں کی فوج کا قلب ہو مبتلائے کرب!
اہرمنوں کے دل پہ ہو حق کی جگر خراش ضرب!
"کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشادِ شرق و غرب!
تیغِ ہلال کی طرح عیشِ نیام سے گزر!

Scanned with CamScanner

بندے سے ہے خُدا قریب، بندہ رہا خُدا سے دُور!
دیدۂ کور کے لئے ایک سے ہیں ظلام و نُور!
پردے ہی جب نہ اُٹھ سکے ایسی نماز کیا ضرُور!
"تیرا امام بے حضُور، تیری نماز بے سُرور!
ایسی نماز سے گزُر، ایسے امام سے گزُر!

اسدُاللّٰہی

شانِ فخر کیا ہے ؟ فقیری میں امیری ! اور شانِ غنا کیا ہے ؟ امیری میں فقیری ! اقبال کا مردِ مومن بیک وقت جنیدؒ بھی ہے اور اردشیر بھی ۔ شبلی و بایزید بھی ہے اور دارا و سکندر بھی ۔ یہی مقام اسدُاللّٰہی ہے اور یہی فقرِ غیور !

اِسلام میں دین و دُنیا دو متصادیا مختلف ادارے نہیں ۔ دین دُنیا کے نقیض کوئی جُداگانہ وجُود نہیں رکھتا اور نہ دنیا کی دین سے علیٰحدہ کوئی حقیقت ہے ، بلکہ انسانی زندگی کو چند صحت مند اصُولوں میں ڈھالنا ہی دین و دُنیا ہے ۔ اسلام مادی اور رُوحانی تقاضوں کا ایک متوازن امتزاج ہے ۔ جو اِنسان کو جمالی و جلالی صفات کا ایک حسین پیکر بنا دیتا ہے ۔ اِنسان کامل میں یہ سلبی و ایجابی کمالات بیک وقت مجتمع ہوتے ہیں ۔ ایک بھی عنصر کم و بیش ہو تو انسان کامل ، انسان ناقص بن جائے گا ۔

اقبال کے نزدیک ایک ہی شخصیت ان جلالی و جمالی صفات اور سلبی و ایجابی کمالات کی مظہر ہوتی ہے ۔ عالمِ انسانیت کو جُدا جُدا خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا ۔ یہاں ؎

"ہر کسے را بہر کارے ساختند"

کا اصُول نہیں چلتا ۔ انسان کی ارتقائی حالت ان تمام صفات کی بیک وقت مظہر ہوتی ہے ۔

نہ اسلام کی تعلیم اجتماعی زندگی کو چار یا کم و بیش پیشوں میں تقسیم کرتی ہے کہ مُختلف جماعتوں کو پیشے کے لحاظ سے معین کر دیا جائے ۔ جن کے ذمے مذہبی تعلیم ، اُمورِ حکومت ، تجارت اور ادنیٰ خدمت لگا دی جائے ۔ نہ یہاں انفرادی زندگی کے مختلف ادوار کو تامّل اور عبادت کے لئے

Scanned with CamScanner

وقف کرنے کی تلقین ہے ۔ یہاں تو اجتماع و انفراد دونوں میں وحدت اور ہم آہنگی ہے، مادیت اور روحانیت میں کوئی حدِ فاصل قائم نہیں ۔

اقبال کا مردِ مومن اسی وحدت اور ہم آہنگی کا مظہرِ اتم ہے ۔ اس کا فقر خودداری ہے ۔ احتیاج سے غنی اور اس کا غنی فقر کے کمالات سے متصف !

اقبال نے اس غزل میں بھی اپنے مثالی کردار " مردِ مومن " کے خصائص فقر کی طرف اشارات کئے ہیں ۔

تضمین

جب دِل میں سماتی ہے خُوئے اَسدُ اللّٰہی — سینے سے نکلتا ہے جب نعرۂ جنگاہی
لڑتی ہے نہنگوں سے جب زار و زبوں ماہی — "جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی !
کھُلتے ہیں غُلاموں پر اسرارِ شہنشاہی"!

اس علم سے کیا حاصل جب ظرف نہ عالی ہو — بے دردِ جگر دِل میں اک نقشِ خیالی ہو
کیا لطف جب آنکھوں میں اشکوں کی نہ لالی ہو — "عطّار ہو ، رُومی ہو ، رازی ہو ، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ و سحر گاہی"!

ہے دُور و دراز اب تک گو منزلِ جانانہ ! — رفتار کی لذّت سے رہرو نہیں بیگانہ
کعبے کے مُسافر لیں کیونکر رہِ بُت خانہ ؟ — "نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ !
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی"!

دِل تنگ نہ ہو انساں، روزی میں نہیں تنگی — ذلّت کی امیری سے بہتر ہے زبُوں حالی
زنہار غُلامی کی منظُور نہ کر خواری ! — "اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی"!

قالینِ منقش سے ہے فرشِ حصیر اُولیٰ ! — کمخوابِ مطلّیٰ سے پوشاکِ حقیر اُولیٰ !
آزادِ نبک سر سے خُود دار اسیر اُولیٰ ! — "دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ !
ہو جس کی فقیری میں بُوئے اسدُ اللّٰہی"!

Scanned with CamScanner

تزویر سپہ آمادہ ہے گردشِ افلاکی ظاہر تو ہیں پاکیزہ باطن میں ہے ناپاکی!
قانونِ دغابازاں عیاری و چالاکی "آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی!
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی"!

نوائے شوق

اِنسان کی ہنگامہ آرائیاں الامان ! آج یہ اشرف المخلوقات ، عالمِ کیف وکم میں صُورِ محشر پھُونک رہا ہے - اس کی نگاہِ تیز حجاباتِ رنگ وبُو میں سے گزُر کر حُسنِ فطرت کو بے نقاب دیکھ رہی ہے - پیہم انکشافات سے ذرّوں کے سینوں میں دِل دھڑک رہے ہیں اور اس کی نگاہِ پردہ در کی برقِ بے پناہ سے آج ستارے بھی لرزہ براندام ہیں - اِن تمام قیامت خیزیوں کا جائزہ لینا شاعر کی چشمِ بینا پر فرضِ عین ہے !

اقبال عظمت آدم کا مبلغ ہے ! جو اسلام کا بُنیادی عقیدہ ہے - ہبُوطِ آدمؑ ، اِنسان کے سفرِ ارتقاء میں ایک اہم موڑ ہے - اس کی خُودی کی تربیت اسی صُورت میں مضمر ہے کہ اسے سراپا خیر جنت سے نکال کر اس دُنیائے خیر وشر میں آباد کیا جائے ، تاکہ وہ اپنے اختیار اور ارادے سے شر کے خلاف رزم آرا ہو کر اسے مغلوب کرے اور خیر کے قوانین نافذ کر کے اپنے آپ کو خلافتِ الٰہیہ کا اہل ثابت کرے -

اِس غزل نما نظم میں اقبال نے لطیف کنایات سے اِنسان کی عظمت واہمیت کے ساتھ ساتھ اِن مشکلات ومواقع کا ذکر بھی کیا ہے جو کشمکشِ حیات میں اس کے لئے مقدر اور ناگزیر ہیں !

قارئینِ کرام ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس کی تضمین میں تضمین نگار کے مصرعوں نے علامہ مرحُوم کے اصل مصرعوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر تاثر میں اضافہ کر دیا ہے -

Scanned with CamScanner

تضمین

میری فغانِ عشق کی دُھوم ہے کائنات میں !
میری صدائے ہاؤ ہُو گُنبدِ شش جہات میں !
میرے ہی دم سے رونقیں انجمنِ حیات میں !
"میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں !
غلغلہ ہائے الاماں بُتکدۂ صفات میں"!

ارض و سما کی زینتیں میری جمالیات میں !
جلوۂ عرش و فرش ہے چشمِ تصوّرات میں !
میری نگاہِ شوخ کی جَست ہے کائنات میں !
"حُور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں !
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں"!

گرچہ ہیں میری کوششیں بزمِ جہاں میں ارجمند!
انجم و مہر و ماہ پر ڈال رہا ہُوں میں کمند!
عقل و خرد کے لب پہ ہے آج صدائے دردمند!
"گرچہ ہے میری جُستجو دیر و حرم کی نقشبند!
میری فغاں ہے رستخیز کعبہ و سومنات میں"!

گاہ مرے خیال میں کون و مکاں کی ہے نمُود!
ناخنِ عقل سے مرے عُقدہ دھر کی کشُود!
گاہ مرے شعُور پر فاش ہے جلوۂ شہُود!
"گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجُود!
گاہ اُلجھ کے رہ گئی اپنے توہمات میں"!

Scanned with CamScanner

عالمِ خُوب و زشت میں بھیج کے دردِ سر دیا!
بُود سے ہست کر دیا، نوش میں نیش بھر دیا!
کر کے اسیرِ رنگ و بُو داغ دل و جگر دیا!
"تُو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا!
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں"!

Scanned with CamScanner

تیرِ نیم کش

ترغیب و تحریص کے ساتھ ساتھ ضرُوری ہے کہ گزشتہ کجروی پر کبھی کبھی ملامت کے تیر بھی پھینکے جائیں تاکہ انسان کا ذہن غنُودہ بیدار ہو کر فردوسِ گم گشتہ کی تلاش کی طرف متوجہ ہو سکے!

اقبال سے پہلے حالی اور اکبر نے بھی طنز و ملامت کے تیر و نشتر آزمائے ہیں اور قومِ خُفتہ کو جھنجھوڑا ہے۔ علامہ مرحُوم نے اس حربے کو بھی تیز تر کر دیا ہے۔

اقبال نے ہندوستانی مُسلمانوں کی بے مقصد زندگی پر کڑی تنقید کی ہے۔ وہ زندگی کا مقصد دُنیا پر صرف مادی تسلّط ہی نہیں سمجھتے بلکہ اخلاقی، معاشی اور معاشرتی انصاف کی قدروں کا نفاذ بھی! ہندوستانی مُسلمانوں کی غیر اسلامی روش انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہ اسے اپنی روایات اپنانے کی جا بجا تلقین کرتے ہیں۔ اعلیٰ مقاصدِ حیات کے حصُول کے لئے عارضی ودیعتِ حیات کی قربانی بھی دینا پڑے تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں۔

شاعر کے نزدیک انسانی علم کا ذریعہ صرف فلسفیانہ فکر و تدبّر نہیں بلکہ رُوحانی تصرّف اور مذہب کی رہنمائی میں مشاہدۂ کائنات سے کشفِ حقائق اور باطنی بصیرت بھی۔

اقبال نے تہذیبِ فرنگ کو بہت قریب سے دیکھا ہے، لیکن اُنہیں اسلامی قدروں سے اس قدر شغف تھا کہ وہ دانشِ حاضر کے چہرۂ روشن سے قطعاً متاثر نہیں ہُوئے، کیونکہ اس کی چنگیزیت بھی ان پر خُوب الم نشرح ہو چکی تھی۔

Scanned with CamScanner

تضمین

فسق و فجور چار سُو، کبر و غرور ہر طرف
رِند خراب فرد فرد ساغر و ساتگیں بکف!
رہبرِ قوم بادہ خوار، قوم اسیرِ چنگ و دف
"میرِ سپاہ ناسزا لشکریاں شکستہ صف
آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہیں کوئی ہدف"!

تیری دُعا ہو کیا قبول، تجھ میں خلُوص ہی نہیں
سینے میں روشنی نہیں، رُوح میں تازگی نہیں
دولت دُوں ہُوئی تو کیا، دل کی تونگری نہیں
"تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں مَوج مَوج دیکھ چکا صدف صدف"!

بزمِ مجاز کو نہ دیکھ چشمِ حقیقت آشنا!
تا بکجُا دتا بکَے گرم سُخن غزل سرا!
کوئے صنم کو چھوڑ کر انجمنِ حرم میں آ!
"عشق بُتاں سے ہاتھ اُٹھا اپنی خُودی میں ڈوب جا
نقش و نگارِ دَیر میں خُونِ جگر نہ کر تلف"!

میں نے پیا ہے خُم پہ خُم بادۂ جامِ مرگ و عشق!
میری نظر پہ ہے عیاں ماہِ تمام مرگ و عشق!

مجھ سے نہ پُوچھ، ہمنشیں رفعتِ بامِ مرگ و عشق!
"کھول کے کیا بیاں کرُوں سِرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف مرگِ حیات بے شرف"!

Scanned with CamScanner

اہلِ خرد کی بزم میں بات کہے یہ کوئی کاش!
فلسفے کے لئے محال راہِ نجات کی تلاش!
رُوحِ قدس کے فیض سے رُوحِ بشر کو انتعاش!

"صُحبتِ پیرِ رُوم سے مجھ پہ ہُوا یہ راز فاش!
لاکھ حکیم سر بجیب اک کلیم سر بکف"!

آج بھی عزم و صدق سے حق پہ ہو گر فِدا کوئی!
دولت و مال و جاں کرے وقفِ رہِ خُدا کوئی!
مثلِ حُسینؓ ہو اگر کُشتۂ کربلا کوئی!

"مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی!
اَب بھی درختِ طُور سے آتی ہے بانگِ لاتخف!"

مَست مئے حجاز ہُوں اور نہیں کوئی ترنگ!
طبعِ غیور پر مری غیر کا چھا سکا نہ رنگ!
مغربیوں کی پیروی میرے لئے ہے وجہِ ننگ!

"خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ!
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف"!

Scanned with CamScanner

فن

فن کے وظیفہ عمل کے متعلق اہلِ نظر کے متضاد نظریے زیرِ بحث رہتے ہیں - ایک طبقے کا خیال ہے کہ فن تخلیق حُسن کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتا - دُوسرا مدرسۂ فکر اس کے برعکس - فن کا مقصد اس سے زیادہ مہتم بالشان سمجھتا ہے - وہ فن کو سماج کا مصلح قرار دیتا ہے - فی الواقع قوموں کو اُبھارنے میں اس کا ایک نمایاں حصہ ہوتا ہے - علامہ مرحوم اسی مؤخر الذکر نقطۂ نظر کے مؤید ہیں اور اس نظم میں اس کی توضیح و ترجمانی ہے -

فی الحقیقت فن نہ صرف زندگی کا عکاس، بلکہ اس کا رہنما بھی ہے - دُنیا کے عظیم شاعروں نے اپنی شاعری سے قوموں کی ترقی کا فریضہ ادا کیا ہے - خُود اقبال کی شاعری مُسلمانانِ ہند و پاک کی نشاۃِ ثانیہ کی زبردست محرک ثابت ہوئی ہے - انہوں نے اس صورِ محشر سے غلام قوم کو بیدار کیا - انہوں نے استحصال و استعمار مغرب کا پردہ چاک کیا اور وطن میں اجنبی اقتدار پر گہری چوٹ لگائی -

شاعر کا فن سیاسی رہنماؤں کے نعروں سے بہت مُختلف ہوتا ہے - شاعر براہِ راست تلقینِ عمل نہیں کرتا بلکہ وہ حُسن و قبح کی سچی تصویریں کھینچ کر قلوبِ انسانی کو حُسن کی طرف راغب اور قبح سے متنفر کر دیتا ہے - گویا وہ صرف اشاروں سے کام لیتا ہے - اس کے فن کی اثر آفرینی سیاسی نعروں کی بہ نسبت دیر اثر لیکن شدید ہوتی ہے -

برصغیر میں غُلامی کی زنجیریں کاٹنے کا سہرا فقط سیاست دانوں کے سر نہیں، بلکہ حالی، اکبر اور اقبال ایسے شاعروں نے پہلے اپنے تعمری فن سے طبائع کو غلامی کے ماحول سے متنفر کر کے قوم کو آزادی کے لئے ذہنی طور پر تیار کیا - سیاست دانوں نے اس کھیت کی فصل کاٹی ہے، جس میں قومی شاعروں نے بہت پہلے بیج بو دیئے تھے -

Scanned with CamScanner

تضمین

فنِ حُسن کی تخلیق میں محسُوب ہے لیکن
یہ حرف پرستی تجھے مرغوب ہے لیکن
تصویرِ مجاز آج بھی محبُوب ہے لیکن

"اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!"

مانا کہ ہُنر مظہرِ ذات ابدی ہے
مانا کہ یہ اثباتِ صفات ابدی ہے
رمزِ ازلی شرحِ نکات ابدی ہے

"مقصُودِ ہُنر سوزِ حیات ابدی ہے!
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا"!

جس سے تہہِ دریا کا سکُوں کم نہیں ہوتا
امواج کا اِک سلسلہ برہم نہیں ہوتا
جس سے لبِ ساحل مترنم نہیں ہوتا

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا!

کیوں تیرا نفس زمزمہ پردازِ ہوس ہو
نغمہ ہو تو برہم زنِ ہر تارِ نفس ہو
مضمُون کی شوخی ہو کہ الفاظ کا رس ہو

"شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا"!

Scanned with CamScanner

بے شوخیٔ افکار سنورتی نہیں قومیں
دُنیا میں ترقی کبھی کرتی نہیں قومیں
یُوں بحرِ حوادث سے گزرتی نہیں قومیں
"بے مُعجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا"!

فقر

فتویٰ مقامِ عوام ہے اور تقویٰ مقامِ خواص! علم ایک حد تک تہذیبِ اذہان کا ضامن ہے لیکن عفتِ نگاہ فقر اور صرف فقر کا حصہ ہے۔ یہ فقر مجبوری و نگوں ساری نہیں بلکہ استغنا اور استعلائے نفس ہے۔

اقبال کا مردِ فقر ایک مجبور و منفی شخصیت نہیں بلکہ وہ ایک مثبت کردار ہے۔ وہ دولتِ دنیوی نہ ہونے کے باوجود اس سے بے نیاز ہے اور اس کے ہوتے ہوئے بھی اس کا قیدی نہیں۔ نہ بے سروسامانی اُسے یادِ الٰہی سے غافل کر سکتی ہے نہ سامان۔ اقبال کا جنید اردشیر سے نہیں دبتا، بلکہ سلیمان بھی اس کے سلمان کے حلقہ بگوش ہیں۔ اس کے اردشیر بھی جنیدی صفات کے حامل اور کسریٰ و جم بھی بوذری خصائص کے امین ہیں۔ فقر و غنا کی یہ تنویت اقبالؒ کے ہاں بڑی دلچسپ اور حسین نظر آتی ہے۔

تضمین

فقر کے آیات ہیں تمکنت و عزّ و جاہ — فقر کے دامن میں ہے سلطنتوں کی پناہ
فقر کے نیرنگ ہیں قدرتِ حق پر گواہ — "فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ"!

Scanned with CamScanner

عِلم کی ہے ایک حد عقل کی ہے ایک حد فقر ازل تا ابد فقر ازل تا ابد !!
علم سراپا نیاز فقر میں شانِ صمد "علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عِفّتِ قلب و نگاہ"!

زندہ و شاداب جانِ فقر ہے مثلِ نسیم فقر سے ہیں وا یہاں رُوح پر بابِ نعیم
فقر سے ملتی رہی ہے دل کو راہِ مستقیم "علم فقیہہ و حکیم فقر مسیح و کلیم
علم ہے جویائے راہ فقر ہے دانائے راہ"!

علم کا معبُود اور فقر کا معبُود اور علم کا مشہُود اور فقر کا مشہُود اور
علم کا مسجُود اور فقر کا مسجُود اور "علم کا موجُود اور فقر کا موجُود اور
اَشہدُ اَن لّا الٰہ اَشہدُ ان لّا الٰہ"!

فقر کے بازو سے ہے معرکۂ حیدری دَبدبۂ خسروی، طنطنۂ سروری
فقر کے جوش سے ہے کوہ وقارِ آدمی "چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خُودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ"!

تیری خُودی کا اگر اپنے پہ اظہار ہو راہِ جمال و جلال تجھ پہ نہ دشوار ہو
گنبدِ افلاک سے تیری نظر پار ہو "دِل اگر اس خاک میں زندہ ہشیار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ"!

Scanned with CamScanner

"ہے دیکھنے کی چیز"

ع ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

شاعر خود مشاہدہ کرتا ہے اور دُنیا کو بھی دعوتِ مشاہدہ دیتا ہے۔ صحیفۂ کائنات کے مطالعہ سے نہ شاعر بے نیاز ہے، نہ عالمِ حیاتیات۔ البتہ طرزِ نگاہ میں اختلاف ہے۔ یہ رگِ گُل پر نشتر رکھتا ہے اور وہ رنگ و بُو کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔

جب شاعر فطرت کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کر دیتا ہے، تو اس مشاہدے سے اس پر کائنات کے اسرار منکشف ہونے لگتے ہیں اور سہ گانہ معرفت حاصل کر لیتا ہے۔ یعنی عرفانِ نفس، عرفانِ کائنات اور عرفانِ خالقِ کائنات یہ مشاہدہ اسے کائنات میں اپنا مقام متعین کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔

شروع ہی سے کلامِ اقبال میں عمیق مشاہدۂ فطرت کے ثبوت ملتے ہیں اور یہ غزل بھی اس شغف کی ایک شاہد عادل ہے۔ اقبال کا مشاہدۂ فطرت انگریز شاعر ورڈزورتھ سے بہت مختلف ہے۔

ورڈزورتھ انسان کو بھی فطرت کا جُزو بنا کر اس میں مدغم کر دیتا ہے، لیکن اقبال اسے کائنات کا صاحبِ ارادہ مبصر قرار دیتا ہے۔

تضمین

ہر پھول کو نگاہ کا ہے انتظار دیکھ — جلوے قدم قدم پہ نمایاں ہزار دیکھ
آیا ہے تو چمن میں چمن کی بہار دیکھ — "گلزارِ ہست و بُود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ!

Scanned with CamScanner

ہے لمحہ لمحہ زیست کا بے اعتبار دیکھ
دے گی فریب گردشِ لیل و نہار دیکھ
موجِ حباب پر ہے نفس کا مدار دیکھ
"آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ
دم دے نہ جائے ہستیٔ ناپائیدار دیکھ"!

انگشترِ خلوص کا رخشاں نگیں ہوں میں
جس پر وفا کو ناز ہے وہ ہمنشیں ہوں میں
آئینۂ سجود ہوں یکسر جبیں ہوں میں
"مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ"!

کون و مکاں میں نور اسی کا ہے جلوہ گر
کعبے پہ منحصر نہ کلیسا پہ منحصر
مشکل ہے یہ کہ حسن کی محرم نہیں نظر
"کھولی ہیں شوق دید نے آنکھیں تری مگر
ہر رہگزر میں نقشِ کفِ پا ہے یار دیکھ"!

Scanned with CamScanner

چشمِ عتاب

دُعا دیتا ہُوں روتا ہوں گِلہ کرتا ہُوں قسمت کا
ہزاروں ڈھنگ اظہارِ تمنّا کے نکالے ہیں

اقبالؒ نے "تصویرِ درد" میں زیادہ تر یہی حربہ استعمال کیا ہے - جذبۂ خلوص اور جوشِ صداقت کے حربوں میں بھی ایک لذّت ہوتی ہے - شاعر کی طعن و تشنیع چونکہ اخلاق و دلسوزی پر مبنی ہے - اس لئے ہمیں اس غصّے پر بھی پیار آتا ہے ! فی الواقع علّامہ اقبال ایسے بزرگ حالؔی کے اس شعر کے مصداق ہیں ؎

ان کے غصّے میں ہے دلسوزی ملامت میں ہے پیار
مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح

علّامہ اقبال نے اس نظم میں برِّصغیر کی مختلف اقوام کو اتحاد اور رواداری کا درس دیا ہے اور ان کے اُس وقت کے رجحانات کی آئینہ دار ہے - لیکن یہ تلقینِ مُحبّت و اخوّت اقوامِ عالم کے لئے اب بھی ایک مستقل قدر ہے - تضمین نگار نے ایک رُباعی میں اس جذبے کی اس طرح تفسیر بیان کی ہے ؎

عیشِ جاوید قیامت ہی پہ موقوف نہیں
رُوحِ اخلاق اگر ہو دلِ انساں میں مکیں
آپ بھی زندہ رہو جینے دو اوروں کو بھی
یہ جو ہو جائے تو بن جائے یہیں پہ خُلدِ بریں

Scanned with CamScanner

تضمین

نہ دیکھی بھول کر بھی آہ بامِ ارتقا تُو نے
بقا کا راز داں بن کر دیا درسِ فنا تُو نے
شکوہ اوجِ کرمنا کو رُسوا کر دیا تُو نے
"کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تُو نے
گزری عُمر پستی میں مثالِ نقشِ پا تو نے"!

ترے دل سے رہے شکوے تری مجبور آہوں کو
نظر کی پستیوں نے کر دیا محدود راہوں کو
چھپا رکھا تری آنکھوں سے جلوہ گاہوں کو
"رہا سر بستۂ محفل مگر اپنی نگاہوں کو
کیا بیرونِ محفل سے نہ دل کو آشنا تو نے"!

عبث مٹتا رہا کافر اداؤں، بے وفاؤں پر
وفائیں تو نے کیں ارزاں وفا ناآشناؤں پر
لگا دی جان کی بازی خیالی مہ لقاؤں پر
"فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر
مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے"!

تعصب ہی فساد انگیز ہے سارے زمانے میں
یہی ہے کارفرما خرمنِ ہستی جلانے میں
اسی کا ہاتھ ہے ہر فتنۂ دوراں اُٹھانے میں
"تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن سمجھا ہے بُرا تو نے"!

خمِ ہستی سے پی لے ماورائے زندگی ہو جا
بصیرت ہے تو بینائے جمالِ سرمدی ہو جا
خود اپنی آگ میں جل کر سراپا روشنی ہو جا
"سراپا نالۂ بیداد سوزِ زندگی ہو جا
سپند آسا گرہ میں باندھ رکھی ہے صدا تو نے"!

مذاقِ حق پسندی تیری بے دینی پہ روتا ہے
ترے جُرمِ غلط کوشی کی سنگینی پہ روتا ہے
تری باطل پرستی کافرِ آئینی پہ روتا ہے
"زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے"!

تقدس کی نمائش سے مگر اے خود نما حاصل؟
نہ ہوگا ایسی طاعت سے بجز کبر و ریا حاصل
غرورِ پارسائی ہے تو یہ سجدے ہیں لاحاصل
"زباں سے گر گیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل؟
بنایا ہے بُتِ پندار کو اپنا خدا تو نے"!

Scanned with CamScanner

دِل

لفظ دیکھیے تو دو حرفوں کی ہم نشینی! وہ بھی ملے ہُوئے نہیں جُدا جدا! حساتیات کی رُو سے نظر ڈالیے تو گوشت کا ایک لوتھڑا! نفسیات کا مطالعہ کیجیے تو جذبات و احساسات کا مرکز! حقیقت پر غور کیجیے تو ہست و بُود، موت و حیات، عرش و فرش، کُل کائنات اِس کے اندر جذب!

ذرّے میں صحرا اور قطرے میں دریا دیکھنا ہو تو دِل کی جلوہ گاہِ ناز میں آجائیے، ہزاروں سال سے داستانِ دِل کہی جارہی ہے اور ابھی تمہید بھی بیان نہیں ہوسکی۔ کوئی کہتا ہے رہزن ہے، کوئی کہتا ہے رہبر ہے! اپنی اپنی سمجھ ہے اور اپنا اپنا نقطۂ نظر! کعبہ کہو تو اور، بُت خانہ کہو تو، ہے دیکھنے کی چیز۔ بقول تضمین نگار ؎

شامل ہیں دو جہاں مرے دِل کے جہان میں
سب کچھ بنا دیا جو مرا دِل بنا دیا!

نظم، دِل کا یہ ٹکڑا اقبالؒ کی ایک نظم فریادِ اُمّت کا ایک بند ہے۔ مکمل نظم علیٰحدہ شائع ہُوئی تھی، لیکن بانگِ درا میں شاملِ اشاعت نہیں ہُوئی۔ یہ بند بجائے خُود ایک وحدت معلوم ہوتا ہے، جس میں علاّمہ مرحُوم نے نہ جانے کتنے دلوں کی کیفیات سمُو دی ہیں۔

تضمین

قیس و فرہاد ہیں دُردی کشِ خمخانۂ دِل — پی کے دیکھے تو کوئی تُند ہے پیمانۂ دِل
ہے اناالحق سے عیاں جُرأتِ رندانۂ دِل! — "قصّۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دِل
التجائے اَرنی سُرخیٔ افسانۂ دِل!"

بُوند بُوند اِس کی چراغِ رہِ عُقبےٰ ہوگی! — آدمی کیا ہے فرشتوں کی تمنّا ہوگی!

Scanned with CamScanner

دیکھنا زندۂ جاوید یہ دُنیا ہوگی ! "یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی !
جادۂ مُلکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل"!

میرے خرمن ہی میں کیا برق چھُپی تھی یارب؟ لُطف تھا لُطف وہ طُوفانِ تجلّی یارب !
نیستی کر گئی لذّتِ چیں ہستی یارب! اَبرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب !
جل گئی مزرعۂ ہستی تو اُگا دانۂ دِل"!

آہ یہ زخمِ جگر چاک ترا سِل جاتا دلِ شیریں کی طرف اُڑ کے مرا دل جاتا
ضربِ تیشہ سے خُود عرشِ بریں ہل جاتا "حُسن کا گنج گراں مایہ تجھے مِل جاتا
تُو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دِل"!

کبھی عُلوی کبھی سفلی ہے جبیں سا اِس پر کبھی اصنامِ مجازی کا ہے دعویٰ اِس پر
حُسنِ مطلق ہے انجمن آرا اِس پر "عرش کا ہے کبھی کعبے کا ہے دھوکا اِس پر
کِس کی منزل ہے الٰہی مرا کاشانۂ دِل"؟

ایک آفت ہے بلا ہے دلِ شیدا اپنا نہ ہُوا، پر نہ ہُوا آہ یہ اپنا، اپنا
روز و شب دل سے لگا رہتا ہے جھگڑا اپنا اس کو اپنا ہے جنُوں، اور مجھے سودا اپنا
دِل کسی اور کا دیوانہ، میں دیوانۂ دل"!

بُت میں آتا ہے نظر جلوۂ یزداں اس کو چشمِ ہر ذرّہ ہے خورشیدِ درخشاں اس کو
لاکھ کافر ہو سمجھتا ہوں مُسلماں اس کو "تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں اِس کو
رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل"!

رُوئے محبُوب سے پردوں کو ہٹا دیتی ہے تشنہ کاموں کے لئے آبِ بقا دیتی ہے
کشتۂ ناز کو دم بھر میں جلا دیتی ہے "خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے
وہ اثر رکھتی ہے خاکسترِ پروانۂ دل"!

خاک میں مِل کے یہ شاداب سوا ہوتا ہے آگ میں بیٹھ کے گلزار نما ہوتا ہے
داغ سے زخم یہ مرہونِ شفا ہوتا ہے "عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے"!

Scanned with CamScanner

قلندری

مقامِ فقر حاصل ہو جائے تو یہی قلندری، سکندری کے لئے باعثِ رشک بن جاتی ہے۔ اقبالؒ کی قلندری کو تجرّد اور ترکِ دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ قلندری صوفیائے کرام کی قلندری سے مختلف ہے، جو اکثر رہبانیت کے سائے میں پلتی ہے ؎

اِک فقر سکھاتا ہے صیّاد کو نخچیری — اک فقر سے کھُلتے ہیں اسرارِ جہانگیری

اقبال کا مردِ قلندر ایک مثبت شخصیت کا حامل ہے۔ وہ دینِ حقہ کا امین اور نفسِ مطمئنہ کا ایک نشان ہے۔ وہ تارکِ الدّنیا نہیں بلکہ دُنیا کے اندر رہ کر دُنیا کار، خسنما اور دنیوی پستیوں سے بالاتر ہستی ہے۔ وہ دولت سے مستغنی ہے اور اگر توانگر ہے تو اس کی توانگری قلندری کے منافی نہیں۔ وہ حکومت کا بے باک نقاد اور شیخ و مفتی کی سطحیت کا پردہ دار ہے۔ اس کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ وہ حقیقت میں صداقت پسند اور حق گو ہے۔ یہ ہے اقبال کا مردِ قلندر، جو اس کے اپنے ہی کردار کا پرتو ہے۔

اقبال نہ صرف نظریاتی طور پر قلندری کا شارح ہے، بلکہ خُود قلندری کی ایک محسُوس اور مجسّم صورت۔ اسی لئے اس کے دِل سے نکلی ہُوئی بات اثر رکھتی ہے۔

تضمین

نظر میں جچ نہیں سکتی توانگری کیا ہے — جو دِل غنی ہے تو پروائے بے زری کیا ہے
غرُور و تاج و نگیں فخر سروری کیا ہے — "نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے"!

Scanned with CamScanner

اسیرِ دامِ فنا ہے، بقا سے نومیدی — یہ رہزنوں سے گِلا، رہنما سے نومیدی
دُعا سے یاس ہے آہ رسا سے نومیدی — "بُتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے"؟

ستم ظریفیٔ تقدیرِ آہ کس سے کہیں — امیر لوگ تو بدمستیوں میں غرق رہیں!
رہے غریب وہ نانِ شبینہ کو ترسیں — "فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے"!

کسی کی چشمِ کرم سے رہا گلہ دِل کا — نگاہ دے نہ سکی آج تک صلہ دِل کا
اب التفات کے قابل ہے مرحلہ دِل کا — "فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دِل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے"!

فنائے عشرتِ دو روزہ پر ہے میری نظر — زوالِ دولتِ دُوں دیکھتا ہُوں شام و سحر
جو تاجدار تھے کل آج ہیں وہ خاکِ بسر — "اسی خطا پہ عتابِ ملوک ہے مجھ پر
کہ جانتا ہُوں مآلِ سکندری کیا ہے"!

رہینِ غیر ہو عشقِ غیور ناممکن! — خدا کا شکر کہ اس کے سوا نہیں مُحسن
مری بلا سے فلاکت میں کٹ رہے ہیں جو دِن — "کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے"!

منافقت سے مبرّا ہے دوستی میری — شمیمِ گلشنِ فطرت ہے عاجزی میری
ورائے رنگِ تکلّف ہے سادگی میری — "خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے"!

Scanned with CamScanner

بانگِ درا

پیامِ عشق

مقصدِ زندگی کیا ہے؟ عرفانِ ذاتِ باری تعالیٰ! اس مقصد کے حصول کے ذرائع کیا ہیں؟ عرفانِ نفس و تسخیرِ کائنات! یہ ایک حقیقت ہے کہ نفی خودی سے تسخیرِ کائنات کے منازل طے نہیں ہو سکتے۔ چونکہ علامہ مرحوم اثباتِ خودی اور استعلائے نفس کے پیامبر ہیں۔ وہ دورِ حاضر کے انسان کو قناعت کے غلط مفہوم پر متنبہ کرتے ہیں اور "دامن دراز" ہونے کی تاکید فرماتے ہیں۔ ایک اور مقام پر اس طرح رقم طراز ہیں ؎

تُو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

مشرق میں قناعت کا یہ مفہوم لیا جاتا رہا ہے کہ اپنے جائز حقوق سے بھی فارغ خطی لکھ دی جائے۔ جہدِ للبقا ترک کر دی جائے۔ قوانین و نوامیس فطرت سے بے خبر رہ کر اپنے آپ کو عناصر کی بے رحمی کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ منفی رویہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، جو انسان کو تسخیرِ ارض و سما کی دعوت دیتا ہے۔

اخلاقی نقطۂ نظر سے اگر ظلم ایک رذیلہ ہے تو انظلام یعنی ظلم برداشت کرنا بھی ویسا ہی رذیلہ ہے۔ عدل ہی اعتدال کا درمیانی راستہ ہے، جو افراط و تفریط دونوں کے شائبے سے پاک اور اسلامی اخلاق کا ایک ناقابلِ حذف اصولِ حیات ہے۔

اُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ، میں اسی حقیقتِ کبریٰ

Scanned with CamScanner

کی طرف اِنسان کی رہنمائی کی ہے، جسے اقبال نے استعارات کی زبان میں عشق کے نام سے یاد کیا ہے۔

حقیقت ہے کہ اسلام کائنات میں حق وعدل کے قوانین نافذ کرنے کے لئے آیا، اسی لئے انسان کا صحیح مقام تعین کیا۔ اقبال نے بار بار اپنے کلام میں اِسلامی عدل کی اقتدار کی طرف دعوت دی ہے اور اس کے ذریعے ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کی راہ سجھائی ہے۔ یہ رجحان اقبال کی شاعری میں ابتدا سے انتہا تک بڑے جوش وآہنگ کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

تضمین

حقیقتوں کا پیام ہے یہ کہ داستانِ مجاز ہو جا
کتابِ اسرارِ عشق بن جا، حدیثِ سوز وگداز ہو جا
نیازمندی کے نغمے ہوں بے قرار جس میں وہ ساز ہو جا
"سُن اے طلب گارِ درد پہلو میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومناتِ دل کا ہُوں تُو سراپا ایاز ہو جا"!

قلندری کی حسین دُنیا الگ ہے دُنیائے سروری سے
تو مردِ شاعر ہے دِل ترا بے نیاز ہے ہر تونگری سے
دِلوں کو جامِ جہاں نما تو بنا رہا ہے سخنوری سے
"نہیں ہے وابستہ زیرِ گردُوں کمال شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا"!

ترے مقدر میں سربلندی ہے ارتقائے کمال تیرا
حیاتِ مستقبل آفریں ہے شکوہِ ماضی و حال تیرا
عیار دُنیائے نو بنے گا جلال تیرا جمال تیرا
"غرض ہے پیکار زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا

Scanned with CamScanner

جہاں کا فرضِ قدیم ہے تو ادا مثالِ نماز ہو جا!

چمن سے ہے اختیارِ گلچیں اِسی سے قائم ہے شانِ تیری
نگاہ کر بار بار گلچیں، اِسی سے قائم ہے شانِ تیری
ترے لئے ہے بہارِ گلچیں اِسی سے قائم ہے شانِ تیری
"نہ ہو قناعت شعارِ گلچیں اِسی سے قائم ہے شانِ تیری
وفورِ گُل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا"!

مئے تجرّد سے مست رہنے اب نہیں ہے نیا زمانہ
حیاتِ ہنگامہ آفریں میں نہیں ہے آئینِ ترکِ دُنیا
رفیقِ اِنسان کا ہو اِنساں یہی ہے انسانیت کا منشا
"گئے وہ ایّام اب زمانہ نہیں ہے صحرا نوردیوں کا
جہاں میں مانندِ شمع سوزاں میانِ محفل گداز ہو جا"!

یہی ہے ایثار کی حقیقت یہی ہیں قربانیوں کے معنی
کہ مقصدِ ارجمند ملّت پہ فرد کر دے نثار ہستی
یہی ہے تدبیر سرفرازی یہی ہے تقدیرِ ہر ترقی
"وجُود افراد کا مجازی ہے ہستیِ قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملّت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا"!

نجات کی گر تجھے طلب ہے تو سوئے یثرب جو راہ پیما
ریاضِ خلدِ بریں کا ضامن ہے دامنِ شہسوارِ اسریٰ
وہی ہے ملجا وہی ہے ماوا وہی ہے آقا وہی ہے مولا
"یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا"!

Scanned with CamScanner

بادۂ خانہ ساز

چطور پیرہن عاریت کنی در بر ؟
لباسِ غرب براندام شرقیاں تنگ است ! (صادق)

فطرتِ غیور کے لئے نظامِ غیر باعثِ ننگ ہے ۔ اپنے امیال و عواطف کے سازگار ماحول میں ہی ایک قوم کی نشوونما و ارتقاء مضمر ہے ۔ نظامِ غیر کا مصنوعی انطباق گول خانے میں چوکھونٹی میز کے مترادف ہے ۔ علامہ مرحوم عطیۂ غیر سے اعراض کر کے بادۂ خانہ ساز کی فرمائش کر رہے ہیں ۔

اقبال کے فلسفۂ خودی کا جزو لاینفک یہ بھی ہے کہ سوال سے خودی مرجاتی ہے ۔ سوال سے مراد صرف کسی فردِ واحد سے استمداد نہیں بلکہ اجتماعی لحاظ سے اغیار کی تہذیبی، تمدنی ، مذہبی ، سیاسی اور اخلاقی قدروں کی گداگری بھی ہے ۔ مادی حوائج کے علاوہ نظامِ غیر کا اقتباس نہ صرف جذبۂ غیرت کے منافی ہے ، بلکہ اپنے ملی مزاج کے خلاف ایک غیر فطری چیز اپنے اوپر ٹھونسنا بھی ہے ۔ اقبال کے نزدیک اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے ۔ اس لئے اُسے یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی ، کہ مسلمان اقوام کسی غیر اسلامی آئین کی نقل کریں اور بالواسطہ آئینِ اسلام کو محتاج عن الغیر ثابت کریں ۔ کیونکہ اسلام صرف عبادات کا نام نہیں بلکہ مہد سے لحد تک زندگی کا ایک دستور ہے ، جس پر عمل پیرا ہو کر انسان نہ صرف حیاتِ عارضی کامیابی سے بسر کر سکتا ہے ۔ بلکہ اسی میں حیاتِ اُخروی کی بھی تشکیل کرتا ہے ۔ جیسا کہ اُن کا مشہور شعر ؎

Scanned with CamScanner

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نُوری ہے نہ ناری ہے!

سے ظاہر ہے کہ اسلام کو مکمّل نظامِ حیات سمجھنے والا مفکّر نظامِ غیر کی بُنیادوں پر اپنے افکار و اعمال کی تعمیر کس طرح گوارا کر سکتا ہے۔

یہی جذبہ اس نظم کی تخلیق کا سبب بنا ہے!

تضمین

عشق نے کر دیا تجھے محرمِ رازِ ارتقاء! — خاک بھی ہے تیری شفا تیری فنا بھی ہے بقاء!
تیری کسک میں اک تڑپ تیری خلش میں اک مزا! — "عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمع بزم حاصلِ سوز و ساز دے"!

کعبہ و دیر فیض یاب بابِ سخی ہے آج وا! — پست و بلند کی تمیز ہو سکی یہاں روا!
اپنوں کو سیر کر دیا، دامنِ غیر بھر دیا! — "شانِ کرم پہ ہے مدار عشق گرہ کشائے کا!
دیر و حرم کی قید کیا جس کو وہ بے نیاز دے"!

ہو جو خُودی سے مستنیر کہتے ہیں رہنما اُسے! — سوزِ نفس سے مل گیا نسخۂ کیمیا اُسے!
دے کے دلِ غم آشنا درد سے بھر دیا اُسے! — "صُورتِ شمع نُور کی ملتی نہیں قبا اُسے!
جس کو خُدا نہ دھر میں گریۂ جانگداز دے"!

پھُول میں وُہ، کلی میں وُہ، برق میں وُہ، شرر میں وُہ! — انجم و مہر و ماہ میں، بحر میں وُہ ہے بر میں وُہ!
قلب میں وُہ، جگر میں وُہ، آنکھ میں وُہ، نظر میں وُہ! — تارے میں وُہ، قمر میں وُہ، جلوہ گہہِ سحر میں وُہ!
چشمِ نظارہ میں نہ تُو سُرمۂ امتیاز دے"!

عشق رہا ہے آشنا اپنی خودی کے راز سے! — عشق غیُور کو مدام کام ہے عز و ناز سے!
عزّتِ نفس جلوہ گر عشق جگر گُداز سے! — "عشق بُلند بال ہے رسم و رہِ نیاز سے!
حُسن ہے مستِ ناز اگر تُو بھی جوابِ ناز دے"!

Scanned with CamScanner

جامِ فرنگ سے بشر خود شکن و خود نگر! بادۂ غیر سے ہُوئی خیرگیٔ دل و نظر!
آتشِ خانہ ساز سے پھُونک دے پھُونک دے جگر! "پیرِ مغاں فرنگ کی مئے کا نشاط ہے اثر!
اِس میں وہ کیف غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے"!

سرو و سمن بدل گئے بوئے چمن بدل گئی! دورِ زماں بدل گیا رسمِ وطن بدل گئی!
رنگِ بیاں اب اور ہے طرزِ سخن بدل گئی! "تجھ کو خبر نہیں ہے کیا بزمِ کہن بدل گئی!
اب نہ خُدا واسطے ان کو مئے حجاز دے"!

Scanned with CamScanner

جذبِ حرم!

عالمِ متغیر و فنا پذیر میں صرف عشق، مستقل اور فنا ناآشنا حقیقت ہے۔ عشق اگر مکان و زمان کی قیود سے آزاد ہے۔ لیکن چونکہ انجمن مجاز کا فروغ جذبِ حرم پر منحصر ہے، یعنی تمام افرادِ ملت بیضا پروانہ وار ایک ہی شمعِ حرم سے وابستہ ہیں اور حرمِ کعبہ ایک محسوس اور خارجی حقیقت ہے۔ اس لئے حرم غیر مرئی نظامِ حرم کا مرئی نشانِ مرکز بن گیا ہے۔

دورِ حاضر میں اقبال اخوتِ اسلامی کا سب سے بڑا مبلغ ہے۔ وہ مسلمانانِ عالم کو اخوت کا ہزار سال کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے۔ اس لئے وہ بلا تمیز نسل، زبان، وطن تمام اہلِ اسلام کو حرم سے وابستگی کی تلقین کرتا ہے جو عشق لامکاں کی مقامی علامت ہے۔

تضمین

طرزِ خواص اور ہے، طرزِ عوام اور ہے — پستیٔ در ہے اور چیز رفعتِ بام اور ہے
جذبۂ پختہ اور ہے، جذبۂ خام اور ہے — "اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے"!

ہے تگ و دو سے زندگی تند مزاج و گرم خوں — لذتِ جد و جہد سے کشمکشِ عمل فزوں
صورتِ رہ گزر نہ ہو پست و حقیر و سرنگوں — "آتی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکوں
کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے"!

پرچمِ دیں بلند ہے، اُمّتِ سرفراز کا — ربطِ نہاں ہے استوار ملّتِ حق نواز کا
ہے یہی مرکزِ یقین نقطۂ ابتدا یہی — "جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے!"

لُطفِ حیات کیا ہے گرتازگیٔ سفر نہ ہو — دورۂ روز و شب نہ ہو شام نہ ہو سحر نہ ہو
جلووں کا اشتیاق ہے بستۂ جام و در نہ ہو — "موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو
گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے!"

عُمرِ رواں کا سلسلہ گرچہ نہیں یہاں دراز — ہستیٔ مختصر میں ہے لذّتِ عشق کا گداز
سوز میں ہے ترا نیاز، سوز میں ہے تری نماز — "شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا راز
غم کدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے!"

Scanned with CamScanner

یقین!

مردِ مومن کا مقام نیابت وخلافتِ الٰہیہ ہے اور یہ مقام یقین ہی کی بدولت حاصل ہوسکتا ہے۔ اپنے مقام کا عرفان عالمِ انسانیت کے سفرِ عرفان کا ایک اہم مرحلہ ہے۔ اسی یقین کی بدولت انسان خلافتِ عظمیٰ پر فائز ہوتا ہے اور اس کے بغیر بقول غالب ؏

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

اقبال کا اہم ترین موضوعِ شعر انسانیت کا مقامِ ارفع ہے۔ اِس مقام کو سائنس نہیں بلکہ مذہب اور صرف مذہب حقہ یعنی اسلام متعین کرتا ہے۔ اسلامی تعلیم کی رُو سے انسان تسخیرِ کائنات سے شرف آدمیت حاصل کرسکتا ہے۔ یقین سے مُراد اسلامی اقدارِ حیات پر ایمان محکم ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے بڑے جوش اور جذبے سے حقائق بیان کئے ہیں۔

تضمین

یہ دُنیا داستاں ہے اور زیبِ داستاں تُو ہے
خُودی کا ترجماں تُو ہے، حقیقت کا بیاں تُو ہے
مکاں و لامکاں کا جوہرِ سرِّ نہاں تُو ہے
"خُدائے لَم یَزَل کا دستِ قدرت تو زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلُوبِ گماں تُو ہے!

Scanned with CamScanner

رضائے حق میں ہوتی ہے رضا شامل مُسلماں کی
رسائی عرشِ اعظم تک نہیں مشکل مُسلماں کی
زمیں کیا آسماں پر ہے صدائے دل مُسلماں کی
"پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مُسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہیں وہ کارواں تُو ہے"!

تری تخلیق نادر ہے کرشمہ دستِ قُدرت کا
تو وہ قطرہ ہے جس میں موجزن ہے سطوتِ دریا
ترے مِٹ کر اُبھرنے میں بقا کی شان ہے پیدا
"مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خُدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تُو ہے"!

فدائے لذّتِ تعمیر ہے ذوقِ نظر تیرا
جہانِ رنگ و بُو میں جلوہ آرا ہے ہُنر تیرا
رگِ گُل تک نہیں محدُود فیضِ نیشتر تیرا
"حنا بندِ عرُوسِ لالہ ہے خُونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تُو ہے"!

سند بخشی گئی تُجھ کو حیاتِ جاودانی کی
تری ہستی نشانی ہے صفاتِ غیر فانی کی
تجھے خدمت ملی ہے لا الٰہ کی ترجمانی کی
"تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تُو ہے"!

الستی انجمن کے عہد کی تجدید کی خاطر
خُدائے لم یزل کی رحمتوں کی دید کی خاطر
شبستانِ ازل میں عیش کی تمہید کی خاطر

Scanned with CamScanner

"جہانِ آب و گِل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوّت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تُو ہے!"

ترے آئین سے امن و اماں قائم ہے عالم کا
جہانبانی تری ہے رحمتِ یزداں کا گہوارا
مُسلماں کی حکُومت ہے امینِ راحتِ دُنیا
"یہ نکتہ سرگذشت ملّتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تُو ہے!"

Scanned with CamScanner

آزاد و محکوم

آزاد و محکوم کا یہ موازنہ مختاری و مجبوری، عزت و ذلت اور سربلندی و نگوں ساری کا محاکمہ ہے۔ چنانچہ اقبال خود اور جگہ کہتے ہیں ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اِک جُوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

یہ حسنِ تضاد اِس نظم میں رواں دواں ہے۔ چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ اس تصویر میں آزادی اور غلامی دونوں نے خدوخال صاف نظر آرہے ہیں۔ علامہ اقبال نے اس نظم میں قوموں کی دونوں کیفیتوں کا گہرا جائزہ لیا ہے۔ اُنہوں نے مشرق میں اپنی قوم کا غلامانہ اور مغرب میں دُوسری قوموں کا آزادانہ ماحول بہت قریب سے دیکھا اور دونوں کو جانچنے اور تولنے کا موقع ملا۔ چونکہ اُن کی شاعری مقصدی شاعری ہے، لہٰذا انہوں نے غلامی کی مکروہ تصویروں سے اذہان میں اس سے بے پناہ نفرت پیدا کی اور آزادی کا شدید جذبہ قلوب میں راسخ کیا!

تضمین

ہمسایۂ افلاک ہے آزاد کا آہنگ — خود دار و جفاکوش و بلاخیز دمِ جنگ
آزاد جگردار ہے محکوم ہے دِل تنگ — "آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ!
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک"!
آزاد کا چہرہ متبسم صفتِ عید — محکوم کا ہر روز شبِ غم کی ہے تمہید

Scanned with CamScanner

آزاد کا دِل نُور فشاں صُورتِ خُورشید ”محکُوم کا دِل مُردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دِل زندہ و پُرسوز و طرب ناک“!

طغرائے مُحبّت دِل روشن نفسِ گرم ایماں کی حرارت دِل روشن نفس گرم
مومن کی وراثت دِل روشن نفسِ گرم ”آزاد کی دولت دِل روشن نفس گرم
محکُوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک“!

محکُوم کہاں واقفِ آدابِ مُحبّت؟ وابستۂ ہر سُود و زیاں اُس کی طبیعت
محکُوم کی فطرت میں ہے دِل تنگی و خست ”محکُوم ہے بیگانۂ اخلاص و مرّوت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے افلاک“!

محکُوم تہی جوش ہے آزاد ہے پرجوش وہ خوگرِ آرام، یہ سرگرمِ جفاکوش
میدان میں یہ اور وہ خلوت میں ہے روپوش ”ممکن نہیں محکُوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک“!

Scanned with CamScanner

"میں اور تُو"

عالمِ اسلام کے کسی فرد سے خطاب کرتے ہُوئے علامہ اقبالؒ نے اپنے آپ کو بھی اِن کوتاہیوں سے مستثنےٰ نہیں کرتے، تاکہ ملامت ناگوار خاطر نہ رہے۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ معیارِ ایمانی پر پُورا اُترنے کی دونوں کو ضرورت ہے اور وہ معیار کیا ہے؟

"چراغِ حرم کا پروانہ وار طواف اور اسلامی قدروں سے مضبُوط وابستگی"۔

عہدِ حاضر میں اقبالؒ اسلامی اقدار کے احیاء کے زبردست نقیب ہیں۔ وہ قومِ خفتہ کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگاتے ہیں اور قرونِ اُولیٰ کے جذبۂ اخوت و خلوص کی طرف دعوت دیتے ہیں، کیونکہ از سرِ نو دینِ حقہ سے شیفتگی کو مُسلمانوں کی ساری بدبختیوں کا مداوا سمجھتے ہیں۔

اِس نظم میں اِسلامی قدروں کی بھرپُور نمائندگی ہے۔

تضمین

نہ مجھے خیالِ رحیل کا نہ تجھے خیالِ رحیل کا
نہ گُداز فکرِ سلیم کا نہ نیازِ اجرِ جمیل کا
نہ تجھی کو ہے نہ مجھی کو ہے کوئی خوفِ ربِّ جلیل کا
"نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاک جادوئے سامری تو قتیل شیوۂ آذری"!

میں ستم رسیدۂ جستجو، تو ستم رسیدۂ جستجو!
میں فریب خوردۂ آرزو، تُو فریب خوردۂ آرزو!
نہ مرے ہی درد کی ہے دوا نہ ترے ہی زخم کا ہے رفو
"میں نوائے سوختہ در گلو تُو پریدہ رنگ رمیدہ بُو

ہیں حکایتِ غمِ آرزو تو حدیثِ ماتمِ دلبری"!

مجھے فکر ہے یہی دم بدم مرے دل پہ ہے یہی بارِ غم — کہ لبوں پہ ذکرِ خدا خدا ہے مگر دلوں میں صنم صنم
رہِ کعبہ پر کبھی اُٹھ سکے نہ ترے قدم نہ مرے قدم — "مرا عیش غم مرا شہد سم مری بود ہم نفسِ عدم

ترا دل حرم گردِ عجم ترا دیں خریدۂ کافری"!

شب و روز مستِ الست رہ غمِ روزگار نہ کر کبھی — کہ مدام گردشِ دہر سے رہے بے نیاز تری خودی
تجھے فکرِ عمرِ دو روزہ کیا جو گزر گئی سو گزر گئی — "دمِ زندگی، رمِ زندگی، غمِ زندگی، سمِ زندگی

غمِ رم نہ کر سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری"!

تری قوتیں تو یقیں میں ہیں کبھی ان پہ بھی ہے تری نظر — کہ مقامِ رفعِ آدمی نہیں مال و جاہ پہ منحصر
تو اسیرِ سود و زیاں نہ ہو کہ گراں بہا ہے ترا گہر — "تری خاک میں ہیں اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر

کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری"!

شب و روز ہے مجھے فکر یہ کہ ہو تازہ رسم و رہِ وفا — یہ حرم کے راہ نورد پھر زندگی کے ہوں رہنما!
وہی ان کے درد میں ہو تڑپ وہی ان کے سوز میں ہو مزا — "کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا

کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری"!

یہ شکایتِ غمِ جاں گزا کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے — کسی غیر سے یہ نہیں گلہ کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
نہیں شکوہ جور کا ناروا کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے — "گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے

کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری"!

ہے وہی بہار وہی خزاں نہ قفس نئے نہ چمن نئے — وہی پھول ہیں وہی خار ہیں نہ غدار سر و سمن نئے
نہ نزاعِ باطل و حق نئی نہ فسادِ دین و وطن نئے — "نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے!

وہی فطرتِ اسد اللہی وہی مرحبی وہی عنتری"!

وہ غیورِ حلقہ بگوش ہیں کہ ہیں بے نیازِ قباد و جم — تری بارگاہِ بلند میں سرِ نازاں کے مگر ہیں خم
تری چشمِ لطف نما کا ہے انہیں انتظار شہِ امم — "کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم

وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری"!

Scanned with CamScanner

دیدہ وری

ترکیب بند طلوعِ اسلام کیا ہے؟ مسلمانوں کے درخشاں مستقبل کا آفتاب عالمتاب! یہ بند گویا اس کی ایک کرن ہے، جسے چمنِ اسلام کے ایک دیدہ ور کی چشمِ بینا دیکھ رہی ہے۔

یہ نظم شاعر کی رجائی نقطہ نظر کی ترجمان ہے۔ شاعر قوم کے افسوسناک اور حوصلہ شکن حال کے باوجود اس کی نشاۃِ ثانیہ سے مایوس نہیں، وہ اپنی نگاہِ ژرف بین سے ملتِ بیضا کے تابناک مستقبل کو دیکھ رہا ہے، جبکہ وہ اقوامِ عالم کی رہنمائی کا حق ادا کرنے کے قابل ہو جائیں گی۔

تضمین

فغانِ مردِ مومن سے ہُوئے برق و شرر پیدا
نگاہوں نے بالآخر کر لئے پھر بام و در پیدا
کیا ہے رحمتِ باری کے دل میں اس نے گھر پیدا
"سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیلُ اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا"!

مسلماں کے مقدر میں بلندی ہی بلندی ہے
ازل سے اس کی قسمت میں مذاقِ حق پسندی ہے
مشیت کو بھی اب منظور اس کی ارجمندی ہے
"کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا"!

نگاہِ خود نگر ہے، در خورِ ہارِ جہاں بینی
ثبات و عزم کی طالب ہے پیکارِ جہاں بینی

Scanned with CamScanner

تجھے سونپا گیا ہے، کارِ دشوارِ جہاں بینی — "جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا!

شمیمِ لالہ و گل گھٹ کے مجبوری پہ روتی ہے — عروسِ غنچہ دردِ مستوری پہ روتی ہے
یہ چشمِ منتظر جلووں سے مہجوری پہ روتی ہے — "ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!"

چمن ہو شعلہ دامن تری برقِ تبسم سے — گرہ کھل جائے کلیوں کی تری موجِ تکلم سے
اٹھے طوفانِ نغمہ تیرے نغموں کے تلاطم سے — "نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا!"

Scanned with CamScanner

زِندگی

میر تقی میرؔ نے کہنے کو ایک سیدھی سادی بات کہہ دی ؎

موت اک زندگی کا وقفہ ہے ! یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

لیکن اس میں زندگی کے اسی تسلسل کی طرف عمیق اشارہ ہے، جس کا مفسّر اقبال ہے اور خُود داستانِ زندگی بھی اسی قدر دراز ہے جتنی خُود زندگی ! ازل و ابد، مکان و لامکاں سب اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔

زندگی کے متعلق یہ متضاد بیانی استغفراللہ۔ کوئی کہتا ہے شاہراہ ہے، کوئی کہتا ہے خُود راہرو ہے اور شب و روز ماہ و سال کے نقوش ؏

شُد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا

بہر کیف زندگی کو ان پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ یہ ایک تسلسل، ایک لطیفۂ غیبی اور ایک کرشمۂ تخلیق ہے، جسے شاعر کی آنکھ دیکھتی ہے، دِل محسُوس کرتا ہے اور زبان بیان کرتی ہے۔ اقبالؒ کی اس نظم میں زندگی کی تمام صحت مند قدریں ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان ہُوئی ہیں !

تضمین

تُو سمجھتا ہے فقط وہم و گماں ہے زندگی — آبتاؤں میں تجھے سرِّ عیاں ہے زندگی !

موت ہنگامی تغیّر جاوداں ہے زندگی — "برتر از اندیشۂ سُود و زیاں ہے زندگی

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی"!

Scanned with CamScanner

امتزاجِ عارضی ہے آب و گِل کا یہ ملاپ ہیں فنا آمادہ گویا ابر یہ بجلی یہ بھاپ
زندگی لیکن بقاء کی فکر کر لیتی ہے آپ "تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی!"

دیکھنے کی طرح دیکھا کر اگر زندوں میں ہے زیست کا ساماں مہیّا کر اگر زندوں میں ہے
زندگی کو یُوں نہ رُسوا کر اگر زندوں میں ہے "اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیرِ کُن فکاں ہے زندگی!"

کیا مزا ہے اُلجھنوں میں عُقدۂ مشکل سے پُوچھ لذّتِ داماندگی داماندۂ منزل سے پُوچھ
راحتِ جوشِ عمل سے جذبۂ کامل سے پُوچھ "زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پُوچھ
جُوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی!"

بندگی میں ڈھل کے رہ جاتا ہے قوموں کا شباب بندگی میں پست ہو جاتا ہے جوشِ انقلاب
بندگی میں ممکناتِ زندگی رُو در نقاب "بندگی میں گھُٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!"

منضبط ہے ارتقاء کی آہنی زنجیر سے روز افزوں ہے یہ اپنی لذّتِ تعمیر سے
آشنا انسان سے اِنسان کی تقدیر ہے "آشکارا ہے یہ اپنی قوّتِ تسخیر سے!
گرچہ اِک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی!"

زیست کیا ہے چشمکِ برق و شرر یا موجِ آب لمحہ لمحہ اک تغیّر دمبدم اِک انقلاب
بے صدا رہ جائے کیا معلُوم کب اس کا رُباب "قلزمِ ہستی سے تُو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!"

ترانۂ ملّی

اِس صدی میں عالم گیر اخوّتِ اِسلامی کی ترجمانی علامہ اقبال کا محبُوب وظیفہ حیات رہا۔ عقیدۂ وطنیّت کی تعلیم و تلقین استعمارِ مغرب کا ایک حربہ تھا۔ تاکہ قومیّتِ اسلام کی جڑ کاٹ دی جائے اور مخلُوقِ خدا اقوام میں بٹ جائے اور صیادانِ مغرب کا شوق صیادی آسانی سے پُورا ہو سکے۔

عصرِ نو کے اِن عیّاروں کا طلسم توڑنے کے لئے علامہ مرحُوم نے اسلامی اخوّت کا ساز اس والہانہ انداز سے چھیڑا کہ تیرہ سو سال کا بھُولا ہوا سبق تازہ ہو گیا اور مراکو کے مُسلمان کا دِل چین کے دُور افتادہ مُسلمان کے دِل کے ساتھ دھڑکنے لگا اور یہ آواز آنے لگی ؎

ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لئے　　نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر

ترانہ ہندی کے بعد "ترانہ ملّی" اقبال کے رُجحان کی نمایاں تبدیلی کا نِشان ہے۔ اب ان کا مطمعِ نظر صرف ہندوستان نہیں رہا تھا، بلکہ عالمِ اِسلام۔ جسے معمارِ مطلق نے سارے جہاں سے نرالا بنایا ہے اور جس کی بنا وطن کا اتحاد نہیں بلکہ دینِ اسلام کی مشترک قدر کلمۂ توحید ہے۔ یہ نظم اِس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ جو شاعر کے لئے شعُور کی نشاندہی کر رہی ہے۔

تضمین

دَورِ زماں کے ھم ہیں دَورِ زماں ہمارا　　پنہائے بحر و بَر میں ہے سکّہ رواں ہمارا
اَوجِ فلک پہ جھنڈا ہے پُرفشاں ہمارا　　"چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مُسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!"

وحدت سے پیار ہم کو وحدت کو ہم ہیں پیارے　　روشن ہے نام اپنا شاہد ہیں چاند تارے

Scanned with CamScanner

زندہ ہیں ہم جہاں میں توحید کے سہارے "توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا!

سَر ہے ہمارا اور ہے حفظِ حَرم کا سودا ہے سُنّتِ خلیلیؑ دائم شعار اپنا
اِس کے طفیل اپنا دُنیا میں سَر ہے اُونچا "دُنیا کے بُتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا!

عزمِ وفائے حق سے جب ہم رواں ہوئے ہیں مہرِ فلک سے اُونچے اپنے نشاں ہوئے ہیں
خارا شگافیوں سے آتش فشاں ہُوئے ہیں "تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا!

حق پر فدا رہی ہے ہر وقت جاں ہماری اعلائے حق کرے گی ہر دم زباں ہماری
پہنچی صدا زمیں سے تا آسماں ہماری "مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا!

دُشمن ہمیں پچھاڑے وہ پہلواں نہیں ہم خطروں سے جی چُرائیں وہ ناتواں نہیں ہم
میدان چھوڑ جائیں ایسے جواں نہیں ہم "باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا!

موجوں سے کب رُکے ہم طُوفاں سے کب ڈرے ہم ٹکرائے بحر و بَر سے ایسے تھے سر پھرے ہم
ڈُوبے سراب میں ہم گرداب میں تَرے ہم "اے ارضِ پاک تیری حُرمت پہ کٹ مرے ہم
ہے خُوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا!

دُنیا سے ہو چکا ہے دِل بے نیاز اپنا عشقِ شہِ مدینہ سامانِ ناز اپنا
اُس چارہ ساز کے ہم وہ چارہ ساز اپنا "سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا!

اُلفت کی وادیوں سے دِل آشنا ہے گویا اسرارِ زندگی پر لب وا ہوا ہے گویا
ہاں منزلِ وفا کا یہ رہنما ہے گویا "اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا!

Scanned with CamScanner

از بالِ جبریل

فرشتوں کا گیت

فرشتے اِنسان کی کوتاہیوں اور گمراہیوں کا جائزہ لیتے ہیں اور عالمِ انسانیت پر ایک طائرانہ نظر ڈال رہے ہیں ۔ گویا یَسۡفِکُ الدِّمَاءَ کی شرح کر رہے ہیں ۔ دورِ حاضر کے اِنسان کے لئے یہ گیت تازیانہ عبرت ہے اور دعوتِ انقلاب ۔

تہذیبِ حاضر باوجود اپنی بلند بانگ دعاوی کے مشرق کے بیشتر خطوں کو اب تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے ۔ علمِ حاضر تعمیر سے زیادہ تخریب کا ذریعہ بن رہا ہے ۔ بقول شاعر تضمین نگار ؎

تباہی کے ذریعے بن گئے علم و ہُنر یارب　　تُلا ہے کیوں ہلاکت آفرینی پر بشر یارب
یہی علم و ہُنر تعمیر کی بُنیاد ہو جائیں　　الٰہی یہ چمن اُجڑے ہُوئے آباد ہو جائیں

اِنسان کی استحصال پسندی اور استعمار دوستی انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے ۔ حُریت پسند اور انصاف دوست شاعر کو اِنسان کی یہ ذلت ہرگز گوارا نہیں ہو سکتی ۔ اِس لئے اس نے فرشتوں کی زبانی اس نامنصفانہ صُورتِ حالات کے خلاف بے پناہ نفرت کا اظہار کیا ہے ۔

تضمین

تنگ نگاہ آدمی عقل کا ہے غُلام ابھی!　　دِل نہیں عشق آشنا ذہنِ بشر ہے خام ابھی!
دُور ہے مقصدِ حیات ختم کہاں ہے کام ابھی　　"عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی!"

Scanned with CamScanner

دین وسیاست وعلوم مردہ دل وتہی ضمیر — وہم پرست آدمی جہل کے دام میں اسیر
سادہ عوام بے شعور، اہلِ شعور بد خمیر — "خلقِ خدا کی گھات میں رند وفقیہہ ومیر وپیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح وشام ابھی"!

اشرفِ خلق اس قدر پست عیارِ بود وہست — تیرہ دماغ وسست فکر کم نظر وہوس پرست
تیرے امیر تنگ دل، تیرے فقیر تنگ دست — "تیرے امیر حال مست تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی"!

خام ہے عقل کا نظام پختہ ہے عشق کا نظام — فیضِ نگاہِ عشق سے بزمِ جہاں کا انصرام
مرہمِ عشق ہی سے ہے زخمِ کہن کا التیام — "دانش وعلم ودین وفن بندگی ہوس تمام
عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی"!

قلب ونظر سے ہے نہاں ہے ابھی حسنِ زندگی — دیدۂ آدمی سے ہے دور مقامِ آدمی
آئینۂ حیات ہے خود نگری خود آگہی — "جوہرِ زندگی ہے عشق جوہرِ عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگیٔ نیام ابھی"!

Scanned with CamScanner

تلافی

طویل نظم شمع و شاعر کا یہ بند پڑھ کر غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

بعد از وقت تلافیٔ مافات ایک دردناک کیفیت اختیار کر لیتی ہے، جس کا عبرت ناک بیان حرمان زدہ عاشق کی زبان پر آکر حُسنِ مجسّم بن جاتا ہے۔ یہ نظم انہی کیف پرور افسردگیوں کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ لیکن اقبالؔ رجائیت کا شاعر ہے۔ یاسیت و قنوطیت کے ایسے لمحات جو اس کی ابتدائی میں منعکس ہُوئے ہیں۔ بطریق شاذ ہیں اور یہ یاس آفرینی بھی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ مستقبل میں معاشرے کی اصلاح و تعمیر کے جذبے کے تحت شاعر اپنے موجودہ ماحول سے بیزاری پر مجبُور ہے اور یہ جذبہ غیر صحت مند نہیں بلکہ اس کے بے پناہ خلُوص کا غماز ہے۔

تضمین

جن کے دل تھے عرش پیما وہ تو رخصت ہو گئے تھے جو ارمانوں کی دُنیا وہ تو رخصت ہو گئے

جن کو تھا شوقِ نظارا وہ تو رخصت ہو گئے "تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے

لے کے اَب تُو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا"!

آہ وہ رندِ کہُن وہ فخرِ ایّام اُٹھ گئے! جن کی آنکھیں دے رہی تھیں مست پیغام اُٹھ گئے

پی کے مینا و سبُو و ساغر و جام اُٹھ گئے "انجمن سے وہ پُرانے بادہ آشام اُٹھ گئے

ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا!

چشمِ گل بربادیٔ گلشن پہ گریاں ہو گئی
ہر کلی فرطِ الم سے چاک داماں ہو گئی
جب کسی کی بے رُخی سے بزم ویراں ہو گئی
"آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو گئی

پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا!

کاش وہ بھی دیکھتے حسرت بھرے دل کی تڑپ
صورتِ برقِ تپاں تھی اہلِ محفل کی تڑپ
سرخرو کب ہو سکی اُف جذبِ بسمل کی تڑپ
"آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا!

اپنے پہلو میں کبھی اپنا دلِ دیوانہ تھا
یاد باقی رہ گئی کوئی چراغِ خانہ تھا
ہائے اس گھر میں بھی روشن جلوہ جانانہ تھا
"بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا

اَب کوئی سودائی سوزِ تمام آیا تو کیا!

سُرمۂ بصیرت

اِنسان میں قوّتِ ارادی کی نشوونما اسے حیاتِ پائندہ بخشتی ہے۔ یہ نظم خُودی، عشق اور ہُنر کے مقتضیات کا ولولہ انگیز بیان ہے۔

قوموں کی رفتارِ ترقی میں ایسے مراحل آجاتے ہیں، جب شکست خُوردگی اور تھکن اُنہیں آگے بڑھنے سے روک دیتی ہے۔ چوں کہ شاعر دیدۂ بینائے قوم ہوتا ہے لہٰذا ایسے موقعوں پر وہ قوم کو اُبھارتا ہے اور اپنی ترغیبی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر سرگرمِ عمل کر دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ساز سخن کے بہانے اپنے ناقۂ بے زمام کو سُوئے قطار لے جا رہا ہے۔

تضمین

عزمِ سفر ہو چُکا کوچ کا ہے فیصلہ — دُور سہی فاصلہ سخت سہی مرحلہ
توڑ نہ یُوں ہاتھ پاؤں چھوڑ نہ یُوں حوصلہ — "گرمِ فغاں ہے جرس اُٹھ کہ گیا قافلہ
ہائے وہ رہرو کہ ہے منتظرِ راحلہ"!

سازِ تصوّف ہے اور وقت کا گانا ہے اور — دورِ تجرّد گیا تیرا ترانہ ہے اور
جدّتِ افکار کے لب پہ فسانہ ہے اور — "تیری طبیعت ہے تیرا زمانہ ہے اور
تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ"!

Scanned with CamScanner

ننگ ہے نامِ خرد، پست ہے بامِ خرد — عشق ہے آتش خرام سُست ہے گامِ خرد
ہو نہ بچھا دیکھنا راہ میں دامِ خرد — "دِل ہو غلامِ خرد یا کہ امامِ خرد
سالکِ رہ ہو شیار سخت ہے یہ مرحلہ!"

بستۂ سُود و زیاں ہے ابھی جس کا ضمیر — تنگِ نظر ہے ابھی، دل کا ابھی ہے فقیر
نُورِ خودی سے نہیں اس کی نظر مستنیر — "اس کی خُودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر
گردشِ دوراں کا ہے جس کی زبان پر گلہ!"

شُکرِ خُدا ہو گئے نالے ترے کارگر — چاک ہے گُل کا جگر دیدۂ شبنم ہے تر
قدرِ ہُنر ہے یہی دل پہ ہو اس کا اثر — "تیرے نفس سے ہُوئی آتشِ گل تیز تر
باغِ چمن ہے یہی تیری نوا کا صِلہ!"

Scanned with CamScanner

او غافل افغان!

یہ نظم ہمسایۂ ملک افغانستان کے غیور باشندوں کے نام اپنی خُودی کو مستحکم کرنے کا وجد آفرین پیغام ہے!

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہ فرزندانِ کہستان، استعمارِ مغرب کی زد سے باہر رہنے کی وجہ سے تہذیبِ نو کی مکاریوں اور فریب کاریوں سے پاک رہے اور اسلامی عزت وخُود داری کی صفات سے متصف! لہٰذا یہ خطہ بھی شاعرِ مشرق، حکیم الامت کی ہمہ گیر اخوت وہمدردی کا مستحق خصُوصی قرار پایا۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے ان کی فطری صلاحیتوں اور اخلاقی قوتوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

اِس پیغام کے پیشِ نظر ہم یہ اُمید رکھنے میں حق بجانب ہیں کہ اس خطّے کے لوگ بھی دُوسرے اسلامی ممالک کے دوش بدوش اپنا مقام اور فرائض پہچان لیں گے اور یہ بھی اسلامی اخوت میں رنگے، ترقی وتعمیرِ وطن کی منزلیں طے کرتے جائیں گے اور نہ صرف ان میں پسماندگی کے کوئی آثار باقی رہیں گے بلکہ ان کی وطن دوستی اسلامی اتحاد سے بھی نہیں ٹکرائے گی تاکہ اقبال کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے کہ ؎

ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر

Scanned with CamScanner

تضمین

دُنیا، دُنیا والے بدلے بدلا ایک جہان! پچھلی رسمیں طور طریقے کچھ دن کے مہمان!
پُورب پچھم، اُتر دکّن رنگ نئے ہر آن! "رُومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان
تُو بھی اے فرزندِ کہستاں اپنی خُودی پہچان!
اپنی خُودی پہچان!
او غافل افغان!

کُہساروں سے ٹکرا کر بادل ہیں گوہر بیز! جنگل پربت مست گھٹائیں دیکھ ہوئیں مے ریز!
تیرے جوشِ عمل سے ہوگی تیری قسمت تیز! "موسم اچھا، پانی وافر مٹی بھی زرخیز!
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان"!
اپنی خُودی پہچان!
او غافل افغان!

موسمِ گُل میں پھُوٹ نہ نکلے وہ کیسا سودا؟ اپنی جولانی سے کر دے اک محشر برپا!
جس کے بگولے تُند نہیں ہیں وہ کیسا صحرا؟ "اُونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا؟
جس کی ہوائیں تُند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان؟
اپنی خُودی پہچان!
او غافل افغان!

آفاقی ادراک میں جس نے پایا اپنا آپ! عزمِ دلِ بے پاک میں جس نے پایا اپنا آپ!
پہنائے افلاک میں جس نے پایا اپنا آپ! "ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ!
اُس بندے کی دہقانی پر سُلطانی قربان"!
اپنی خُودی پہچان!
او غافل افغان!

Scanned with CamScanner

مکر کے جال بچھاتے ہیں تہذیب و تمدن آج ! تیری سادہ معیشت پُرکاری کی نہیں محتاج !
تیرے سر پر جس نے سجایا خودداری کا تاج ! تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج !

عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان !
اپنی خودی پہچان !
او غافل افغان !

Scanned with CamScanner

از بالِ جبریل

اپنے جاوید کے نام

یہ نظم جوہرِ ذاتی کی آئینہ دار ہے جو بے سرو سامانی کے مواقع کو دُور کر کے منصۂ شہود پر آجاتا ہے۔ خودی کی تربیت منّتِ غیر سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

اقبالؒ کا یہ پیغام نہ صرف اپنے جاوید کے نام ہے بلکہ ملّتِ مُسلمہ کی ساری اُبھرتی ہُوئی پود یا قوم کے تمام "جاویدوں" کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے کہ اُنہیں فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں کسی طرح اپنے آپ کو اسلامی کردار کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے شاہین بچے کس طرح اپنے آپ کو اس صحت مند پیغام کے اہل ثابت کرتے ہیں۔

تضمین

نظامِ خام جہاں میں قوام پیدا کر!
نیا نظام نیا انتظام پیدا کر!
مٹائے مٹ نہ سکے جو وہ نام پیدا کر!
"دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صُبح و شام پیدا کر"!

نگاہ دے تو حقیقت شناس دے تجھ کو
جو ظرف دے جو مروّت شناس دے تجھ کو
دماغ دے تو لطافت شناس دے تجھ کو
"خُدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گُل سے کلام پیدا کر"!

Scanned with CamScanner

ترے وجُود میں مضمر ہے عالمِ امکاں — متاعِ غیر پہ حاشانہ ہو کبھی نگراں
خُودی کا ننگ ہے انساں پر منّتِ انساں — "اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر"!

تری حیات میں سب ممکنات ہیں مضمر — خُدا کرے کہ نہ ہو تُو کسی کا دستِ نگر
چراغِ قلب و نظر ہے مری متاعِ ہُنر — "میں شاخِ تاک ہُوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر"!

خُودی نہیں تو غلامی ہے، سر بزیری ہے — خُودی کی موت خُود انسان کی اسیری ہے
خُودی کے فقر میں بھی لذّتِ امیری ہے — "مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خُودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر"!

Scanned with CamScanner

پیشگوئیاں

یہ نظم مستقبل قریب کے متعلق اُمید افزا قیاسات کا دلآویز مرقع ہے۔ شاعر کی چشمِ بینا واقعات و کوائف آئندہ کا آئینہ ہوتی ہے۔ جس میں بدلتی ہُوئی دنیا کے خدّ و خال صاف نظر آتے ہیں۔

ان میں سے کچھ پیشگوئیاں تو پُوری ہو چکی ہیں اور ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ واقعات دیکھ لئے ہیں۔ کچھ مردِ ایّام سے اپنے اپنے وقت پر ظہُور پذیر ہو کر رہیں گے جنہیں اگلی نسلیں محسُوس صُورت میں دیکھ سکیں گی۔

اقبالؒ نے ۱۹۳۵ء میں بالِ جبریل شائع کی تو اس میں اپنی چشمِ بصیرت کا اس طرح ذکر کیا تھا ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے!
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے!

اور تضمین نگار نے بھی علّامہ مرحوم کے اِس اظہارِ خیال سے بہت سال ۱۹۳۱ء میں اس قسم کا شعر کہا تھا ؎

تڑپ رہے ہیں ہزاروں جلوے مری نگاہِ مآل بیں میں!
مجھے نظر آ رہی ہیں قومیں جو ہیں پسِ پردۂ زمیں میں!

لیکن اِن قوموں کے صحیح خدّ و خال تو مستقبل ہی دیکھ سکتا ہے۔ اپنے اپنے رنگ میں دونوں کے دعوے حقیقت پر مبنی ہیں، البتہ ان کی صداقت پر مُہرِ تصدیق ثبت کرنا مستقبل کے اِنسان کا حصّہ ہے۔

Scanned with CamScanner

تضمین

کیا ہُوا گر ہیں فضائیں اِن دنوں ظُلمت بدوش! ظُلمتوں کا دیکھنا ہو کر رہے گا سرد جوش!
جلوۂ خُورشید پھر ہونے کو ہے حیرت فروش! "آسماں ہوگا سحر کے نُور سے آئینہ پوش
اور ظُلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی"!

ہر کلی کے ساز میں نغمے ہیں کتنے بے قرار پتّے پتّے کو یہاں وجد آئے گا بے اختیار!
اِس قدر ہوگا تبسّم آفریں گُل کا نکھار "اِس قدر ہوگی ترنّم آفریں بادِ بہار!
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی"!

صرف تعمیرِ چمن ہوگی چمن کی مُشتِ خاک! جھُوم کر دے گی پیامِ زندگی ہر شاخ تاک!
گردِ غم سے اہلِ دل کے سینے ہو جائینگے پاک! "آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک!
بزمِ گُل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی"!

گریہ سامانی سے ہو جائے گی چشمِ دھر باز! گرمیٔ احساس سے ہو جائے گا ہر دِل گداز!
کھول کر رکھ دیں گے میرے اشک میرے دل کا راز! "شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اِس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی"!

آج شدّادوں کی شدّادی بھی ہے رُو در زوال! اہلِ استبداد خُود ہو کر رہیں گے پائمال!
ٹُوٹ کر رہ جائیں گے خونخوار صیادوں کے جال "دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل!
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی"!

ہو گئی ایماں کی پھر قلبِ مومن میں نمود! پھر گھٹا الحاد کی اُڑ جائے گی مانندِ دُود!
رحمتِ باری بنے گا پھر مُسلماں کا وُجود! "پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجُود!
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی"!

پھر مکافاتِ عمل کا دور آئے گا ضرُور! خاک میں مِل جائے گا پھر اہلِ دولت کا غرُور!
پھر دلِ مظلُوم میں ہوگا مسرّت کا ظہُور! "نالۂ صیّاد سے ہوں گے نوا ساماں طیُور!
خونِ کلیوں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی"!

Scanned with CamScanner

اہلِ محفل کو ابھی نغمے سُنا سکتا نہیں! اپنے دِل میں گُنگُنا لیتا ہُوں گا سکتا نہیں!
دیکھتا جاتا ہُوں اوروں کو دکھا سکتا نہیں! "آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں!
محوِ حیرت ہُوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!"

Scanned with CamScanner

اختتامیہ

Scanned with CamScanner

آغا صادق

علاّمہ اقبالؒ کے رُوحانی شاگرد

اُردو شاعری حالی اور اکبر الہ آبادی تک اپنی تمام دیرینہ روایات کے ساتھ ملتی ہے۔ یہی حال پاک و ہند میں جنم لینے والی فارسی شاعری کا ہے۔ اِن روایات میں غالبؔ نے پہلی دفعہ فلسفے کا اضافہ کیا اور یہی فلسفیت غالبؔ کی بے پناہ مقبولیت کی اساس ہے۔ حالی اور اکبر نے شعر کو قومیت کا تصور دیا بلکہ حالی نے تو غزل کو مُسلمان کرنے کی جسارت بھی کر دی

علاّمہ اقبال نے سب سے پہلے ہماری شاعری کو اِنسانی عرفان کا موضُوع بخشا۔ انہوں نے خُود نگری و خُود شناسی کے مقصدِ اعلیٰ کے لئے تنگنائے غزل میں اپنے خیالات کو ڈھالا۔ علاّمہ صاحب سے پیشتر "ہمہ اوست" کا نظریہ شعری دُنیا میں کچھ اس شدّ و مد کے ساتھ کارفرما تھا کہ اِنسان اپنی ہستی کی مکمّل نفی کی طرف مائل ہو چکا تھا اور یہ بے عملی اور مایُوسی اِنسانی تقدیر کا نقطۂ آخر بنتی جا رہی تھی۔ اقبال نے اِنسانی عرفان کی طرف رہنمائی کی اور اِنسان کی ایک علیٰحدہ ہستی کا تعیّن کیا اور پھر اس ہستی کی پہچان کو ہی انسانی عظمت کا مدار ٹھہرایا۔ چنانچہ اِس پہچان کو ہم خُودی کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ یہ فکری رجحان اور اُردو شاعری کے لئے ایک بالکل نئی چیز تھی، جس نے شعر کے پُرانے ڈھانچے کو پُوری طرح سے لرزہ براندام کر دیا۔ چنانچہ اقبال کے بعد لکھنے والوں نے اس موضُوع کو اُٹھا لیا اور آغا صادق بھی انہی لکھنے والوں میں شامل ہیں۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر آغا صاحب کا فارسی مجمُوعۂ کلام "شاخِ طُوبیٰ" ہے، جس کے اِنتساب میں ابتدائی الفاظ یہ ہیں۔ "بنامِ شاعرِ اعظم مشرقِ زمین علاّمہ اقبال مرحُوم"

آغا صاحب علاّمہ اقبال سے متاثر ہیں اور اس کا اظہار فخریہ انداز میں بڑی خوبصُورتی سے کرتے ہیں ؎

خم آشام اقبال پیمانہ ام — نگاہش دید رقصِ مستانہ ام
زانداز آں آفتابِ سخن — شدہ شعلۂ طورِ جاں در بدن

Scanned with CamScanner

که اقبال زندہ است پائندہ باد — از او روئے او باء شرمندہ باد
بلند از مقامِ فنا بامِ اوست — کہ تعمیرِ ملت ز پیغامِ اوست

علامہ اقبال اپنے عرفان کو ایک موقع پر یوں بیان فرماتے ہیں :-

در دشتِ جنون من جبریلِ زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

آغا صادق علامہ علیہ رحمتہ کی رفعتِ خیال کا تذکرہ اپنی ایک نظم "سراپائے اقبال" میں بالکل اسی انداز سے بیان کرتے ہیں اور علامہ صاحب کی علامتوں کو ہی ذریعۂ اظہار فرماتے ہیں ؎

خیالِ حضرتِ اقبال از صادق چہ مے پرسی — عقابِ عرش پیما جرّہ گردوں سوار است ایں
ضیا افگن چو روز است ایں چراغِ خود فروز است ایں — گہے جبریل گیر است ایں گہے یزداں شکار است ایں

آغا صادق نہ صرف علامہ اقبال کے بہت بڑے مداح ہیں، بلکہ ان کے اسلوبِ نگارش کے کامیاب مقلد بھی "خطاب بہ اقبال" میں کہتے ہیں ملاحظہ فرمایئے علامہ کی وجدانیت کو کتنے خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

صد قیس دشتِ گرد بدشتِ جنون تست — صد لالہ ہائے خوں بگریبان باغِ تو
صد داغ ہائے سوزِ محبت بہ سینہ ات — صد جلوہ ہائے مہرِ درخشاں ایاغِ تو
ملت ز نالۂ تو ز خوابِ گراں نجاست — بانگِ زدی کہ غلغلہ تا آسماں نجاست

آغا صادق قادر الکلام ہیں - ان کے اشعار میں بڑی سلاست اور روانی ہے - وہ مشکل سے مشکل مضمون کو بڑی آسانی اور بے تکلفی سے لیکن معنی آفرین الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں - اقبال کا ایک مشہور شعر ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہی مضمون بڑے سادہ انداز میں آغا صاحب کے ہاں بھی ہے ؎

قرن ہا باید کہ آید در جہاں
راز دانے محرمے بے ہمسرے

اسلامی نظامِ حیات میں عربی و عجمی ، امیر و غریب ، بندہ و آقا اور رنگ و نسل کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا بلکہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں اور ایک ملتِ اسلامیہ کے فرد ہیں -

علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ ساسانی

آغا صاحب بھی اس اسلامی اخوت و مساوات کے علمبردار ہیں ؎

Scanned with CamScanner

زحرفِ لاالہ ما را نظام است　　میانِ ما اخوت بر دوام است
دلِ ما را ز داریک پیام است　　تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است

"شاخِ طوبیٰ" کے اندازِ فکر و نظر پر پوری طرح علامہ اقبال کے افکار کا رنگ ہے۔ آغا صاحب بھی انسانی عرفان پر ایمان رکھتے ہیں اور اس عرفان کو عشق کا مرہونِ منت سمجھتے ہیں بلکہ ان کے جذبۂ عشق کی بلند پروازی نے خرد کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔

زِ فیضِ عشق پروازم ورائے آسماں باشد
خرد دیوانہ شُد از رفعتِ بامے کہ من دارم

علامہ صاحب کی خودی جب اپنے عروجِ کمال پر پہنچتی ہے تو خدائے تعالیٰ ورودِ تقدیر سے پہلے بندے کی رضا جوئی بھی ضروری سمجھتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہی تصور آغا صاحب کے ہاں ملتا ہے ؎

کیست منکر کہ گہی بندہ خدا را جوید
طالبِ بندہ شود گاہ خدا آخر شب

اِنسان جب خود نگری اور خود شناسی کی بستی سے کندن بن کر نکلتا ہے تو اس کی خاک کا ایک ایک ذرہ رشکِ خورشیدِ قیامت بن جاتا ہے اور اس کے سوز و ساز اور اس کی تڑپ پھڑک ایک ایسا طوفانِ عظیم بن جاتی ہے، جس کے سامنے صورِ محشر کی بھی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

آغا صاحب کے الفاظ میں اس مضمون کو دیکھئے ؎

رشکِ خورشیدِ قیامت ذرۂ خاک من است　　صورِ صد محشر خجل از آہِ بے باکِ من است
اگر از چشمِ من یک قطرۂ آتش فشاں ریزد　　نشاطِ فرشیاں سوزد بساطِ عرشیاں ریزد

اقبال کے ہاں مردِ مومن کا جو تصور پایا جاتا ہے، وہی تصور اپنے تمام تر علو و عرفان کے ساتھ آغا صاحب کے ہاں بھی ملتا ہے۔

طے کند جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے کا معجزہ یہاں بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

صید رحمت می کند آہ کمند آسائے من
آنچہ زاہد در دعا جوید بہ فتراک من است

جامِ جم اُردو اور فارسی شعری روایات کا ایک قدیم عنصر ہے۔ لیکن آغا صاحب یہاں اس روایات سے بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں جذبہ اور خلوصِ جذبہ روایات سے مقدم ہیں۔ وہ اپنے آفاقی مردِ مومن کو جامِ جم سے زیادہ منزہ اور شفاف پاتے ہیں اور خاص طور پر اس لئے کہ جامِ جم اس دنیا تک محدود ہے اور دلِ مومن دو عالم کی جلوہ گاہ ؎

چہ شُد گر جامِ جم بنمود احوالِ جہان را
دو عالم جلوہ افروز است در جامے کہ من دارم

Scanned with CamScanner

عقل سود و زیاں کی تمام بحث سے فارغ ہو کر رو بہ عمل ہوتی ہے - وہ جذبے سے تہی دامن ہے، اس لئے اسے قائل کرنے کے لئے برہان کی سحر کاری درکار ہے - اسے ہر فعل پر دلائل کی احتیاج ہے - دوسرے لفظوں میں اُسے تنقید سے فرصت نہیں، لیکن بحث و نقد کے بعد اور دلائل و براہین کی زور آفرینی سے اگر کسی نیک و بد کا تعین کر بھی لیا جائے تو بھی وہ لذتِ ایمان سے بہت دُور رہتی ہے ؎

شررِ عقل بہ سوزِ دلِ عارف نرسد
لُطفِ برہان دگر و لذتِ ایماں دگر است

اصل اشیاء کی متلاشی حسیات پردہ ساز کے حجابات اُٹھا کر نوا ہائے راز سے بلا واسطہ فیضیاب ہوتی ہیں، بلکہ اب بھی آواز کا ایک پردہ باقی رہ جاتا ہے - صورتِ اشیا ایک دھوکہ ہے اور صورتوں کی یہ ہیئت کذائی دانائے راز اور محرم راز دورِ میخانہ کی نظروں میں سوائے تفریقِ رنگ و بُو کے اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی - اس کے لئے آئینہ سنگ میں سوائے اختلافِ القاب کے اور کوئی وجہ تمیز نہیں - آغا صادق اس مضمون کو پیچیدہ فلسفیانہ اسلوبِ نگارش دینے کی بجائے لباسِ غزل میں پیش کرتے ہیں اور فنی نقطۂ نظر سے یہی کسی فنکار کی معراج ہوتی ہے ؎

نگاہِ من بہ تماشائے اصل اشیا رفت
تو آنچہ آئینہ بینی بہ پیشِ من سنگ است
تو نہ آئی کہ نظیرت بہ تصور آید
لب لعلت دگر و چشمۂ حیواں دگر است

علامہ اقبال نے مغربی تہذیب و دانش کو اعلیٰ انسانی کے اقدار کے لئے ہمیشہ ہلاکت آفرین سمجھا ہے اور اس بارے میں انہوں نے اتنا کچھ کہا ہے کہ وہ محتاجِ بیان نہیں - آغا صاحب کا اس موضوع پر بھرپور شعر ملاحظہ فرمائیے -

مخور کہ بادۂ افرنگیاں بلاخیز است
خودی گداز و جنوں سوز و فتنہ انگیز است

اس مضمون کو وہ خالص غزل کے لہجے میں ادا کرتے ہیں -

حذر ز دلبرِ تہذیبِ نو بیاید کرد
کہ عشوہ زیر چکان است و لب شکر ریز است

آغا صاحب کے اسلوبِ نگارش کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی فلسفیانہ اور پیغامی موشگافیوں کو غزل کے بھرپور انداز میں پیش کیا ہے - انہوں نے غزل کی روایتی علامتیں استعمال کی ہیں، لیکن ان کے مفہوم میں تغیر پیدا کر دیا ہے - مندرجہ بالا دونوں اشعار کے موضوع کو ایک اور رنگ میں پیش کرتے ہیں - جس میں رمز و کنایات اپنی تمام دلفریبیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں -

چشمِ مستش تہ آں ابروی خمدار خطا است
تیغ در قبضۂ مے خوار نمی بائستے

حق تو یہ ہے کہ اپنے بے پناہ پُرکشش اسلوبِ بیان، فلسفیانہ اندازِ فکر اور اعلیٰ فنی مذاق تغزل کے اعتبار سے

Scanned with CamScanner

آغا صادق علامہ اقبال کے مقلدین میں سب سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ کلام اقبال کی تعریف میں آغا صادق کا ایک شعر سن لیجئے، جو ان کے دلی جذبات کا مظہر ہے۔

از کلامِ او بہ دل ہا موجزن
جوئباری سلسبیلی، کوثری

——— : اکبر حمیدی